آفتابِ مہران
شاہ عبداللطیف بھٹائی کے فن اور
شخصیت پر ایک جامع کتاب
ایم۔ایس ناز
قیمت
16
روشن کتابیں
مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

پیارے قارئین!

گذشتہ دنوں ہم نے اپنے قابلِ قدر ادیبوں اور مصنفوں سے ایک درخواست کی تھی کہ وہ روشن کتابوں کے بلند تر مقاصد کو ایک عظیم اور روشن منزل سے ہمکنار کرنے کے لیے ہماری معاونت فرمائیں کیونکہ پہاڑ جیسے بلند اور فلک جیسے عظیم مقاصد کو پُورا کرنے کے لیے محض ایک یا دو اشخاص کافی نہیں ہُوا کرتے۔ اِس ضمن میں ہم نے خود اپنے ادیبوں اور مصنفوں کے دولت کدوں پر پہنچ کر جبیں سائی کی اور انہیں روشن کتابوں کے جُملہ مقاصد سے آگاہ کیا۔ چنانچہ ہمیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ہمارے اور اُن کے جذبات اور مقاصد مکمل طور پر ہم آہنگ اور قطعی طور پہ مشترک ہیں۔ ہماری منزل ایک ہے۔ یہاں تک کہ منزل تک پہنچنے کے لیے سامانِ سفر بھی ایک جیسا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے منزل تک پہنچنے کے لیے ہم دو الگ الگ راستوں پر چل رہے تھے۔ لیکن اب ہمارا راستہ بھی ایک ہوگا۔ منزل تو پہلے ہی ایک تھی۔ ہمارے ادباء اور مصنفین نے ہمیں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ بعض نے تو یہاں تک کہا کہ ہمارا آپ سے تعاون' روپے پیسے کے چکر سے آزاد ہوگا۔ لیکن ہم نے اسے قبول نہیں کیا۔ اگرچہ کسی ادیب یا مصنف کو اُن کی محنت کا صلہ بھی دیا ہی نہیں جا سکتا لیکن پھر بھی دُنیا والوں نے محنت کو ناپنے کے لیے روپے پیسے کا پیمانہ بنا رکھا ہے۔ اِسے ہم معاوضہ نہیں نذرانہ کہتے ہیں۔ اس وقت ہم یہاں اپنے قابلِ قدر دوست اور مہربان جناب خواجہ محمد اسلام کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ قارئین کو نوید ہو کہ محترم خواجہ صاحب نے اپنی مقبولِ عام اسلامی کتب "موت کا منظر" "محبوبِ خُدا کی دُعائیں" "جنت کا منظر" اور "حُسن پرستوں کے انجام کا منظر" کو روشن کتابوں کے تحت شائع کرنا منظور کر لیا ہے۔ اب یہ گرانقدر اسلامی کتب معمولی قیمت پر ہمارے قارئین حاصل کر سکیں گے اور زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں گے۔ یہ تمام کتب انشاءاللہ جلد ہی یکے بعد دیگرے آپ تک پہنچ جائیں گی۔ آپ نے کہا تھا کہ اسلامی موضوعات پر کُتب شائع کی جائیں۔ خُدا کا کرم ہے کہ آپ کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔

ہمارے نوجوان ادیب جناب ایم۔ ایس ناز "آفتابِ مہران" لیے حاضر ہیں۔ سندھ کے مشہور صوفی بزرگ اور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شخصیت اور فن پر ایم۔ ایس ناز نے بڑی محنت اور کاوشوں سے مواد اکٹھا کر کے اِسے بڑے خوبصورت انداز میں ترتیب دیا ہے۔

ہماری آئندہ کتاب "گولڈ فنگر" ہوگی۔ آئن فلیمنگ کا ایک شہرہ آفاق ناول جسے اسرار زیدی نے ترجمہ کیا ہے۔

نیاز احمد

روشن کتابیں گھر گھر پہنچانے کے عظیم منصوبے کے تحت
شاہ عبداللطیف بھٹائی کے فن اور شخصیت پر
ایک جامع کتاب

آفتابِ مہران

ایم۔ ایس ناز

مطبوعات شیخ غلام علی
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

انتساب

ابن انشا کے نام

جنہوں نے شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی
داستانوں کا منظوم ترجمہ کر کے میرے دل کے
جذبات کو آفتاب مہران کی کرنوں سے منتج کیا

کرن کرن

ھالا سے حجاز تک

پیش لفظ

السلام اے مشعلِ راہِ ھدا
السلام اے عاملِ قرآں لطیف
السلام اے آفتابِ معرفت
السلام اے پیکرِ ایماں لطیف

ہزار ہزار رحمتیں ہوں، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار اقدس پر، کہ جہاں شبانہ روز سیکڑوں افراد عقیدت اور محبت کے پھول نچھاور کرنے آتے ہیں۔ روضے کی صندلی جالی سے جھانکتے ہوئے ان کی نگاہیں پرنم ہوتی ہیں، ہاتھ مصروفِ دعا ہوتے ہیں۔ اور لرزتے کانپتے ہاتھوں پر تمنائیں اور آرزوئیں مچل رہی ہوتی ہیں وہ دھڑکتے دلوں کے ساتھ عالم بے قراری میں آتے ہیں اور سکون و طمانیت کی دولت سے سرشار ہو کر جاتے ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نام نامی اسم گرامی سے کون آشنا نہیں۔ سندھ کے بچے بوڑھے اور جوان سب ہی آپ کی الفت کا دم بھرتے ہیں اور آپ کی اخوت کے ترانے گاتے ہیں۔ ہالا سے حجاز تک پھیلی ہوئی آپ کی زندگی کا ہر نقش، نقشِ جاوداں ہے۔ ہالا، برصغیر کے اس خطے کا گوشہ مقدس ہے، جہاں سب سے پہلے اسلام کا پیغام پہنچا۔ اور یہاں کے باشندوں نے توحید کی امانت کو اپنے سینوں میں جگہ دی۔ اور آئندہ نسلوں تک اس وراثت کو بہ کمال احسن و دیانت پہنچایا۔ اسلامی علوم کی تشنگی میں یہ لوگ عراق و ایران و حجاز تک جا پہنچے اور ائمہ اور علمائے دین سے اکتسابِ فیض کر کے تفسیر، حدیث، فقہ، رجال، کلام اور شعر و ادب میں مہارت حاصل کر کے تاریخ میں اپنا نام پیدا کر گئے۔ ان میں حضرت ابوالعطا سندھی اور شیخ ابراہیم دیبلی ایسے علماء شعراء اور ادباء سندھ سے ہر کوئی واقف ہے جن کی بدولت علوم اسلامیہ کی اشاعت ہوئی اور جب یہ سلسلہ بارھویں صدی ہجری تک پہنچا تو سندھ علم و عرفان کا مواج سمندر بن گیا۔ اس دور میں ایک طرف شیخ ابوالحسن کبیر، شیخ محمد حیات محدث، مخدوم محمد معین اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی جیسے متبحر علماء پیدا ہوئے، تو دوسری طرف شاہ عنایت اللہ شہید، شاہ عبداللطیفؒ اور سچل سرمستؒ جیسے اربابِ طریقت و عرفان، کہ جنھوں نے اپنے دلآویز نغموں سے عوام و خواص کا دل موہ لیا اور ان میں زندگی اور معرفتِ حیات و کائنات کی امنگیں پیدا کیں۔ درحقیقت یہ واھب العطایا کی عطا تھی کہ سلطان الشعراء شاہ عبداللطیف بھٹائی جن کو عوام "لال لطیف" کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں، وہ قبولیتِ عام اور محبوبیت و شہرت حاصل کر گئے۔ جو اپنی نظیر آپ ہے۔ آج شاہ عبداللطیف اس خطے کے مقامی شاعر ہی نہیں، بلکہ ایک عالمی شخصیت بن چکے ہیں ان کے گل ہائے فکر و نظر کی مہک ہر انسان کے دل و دماغ کو معطر کرتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں خطۂ سندھ کے کچھ ایسے خصوصی امتیازات ہیں، جو اہل علم، اہل بصیرت اور اہل دل کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اگر اس خطے کو باب الاسلام کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس برصغیر میں اسلام کی کرنیں سب سے پہلے اسی سرزمین پر پھیلیں۔ اس خطے میں مسلمانوں کی حکومت کو زیر کرنے میں انگریزوں کو سب سے زیادہ دیر لگی اور اس طرح یہاں دورِ غلامی سو برس سے بھی کم رہا۔ انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی میں اس علاقے کے خواص اور عوام پیش پیش رہے ہیں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اور ان کے ساتھیوں کو حکومت ہند سے بغاوت کے جرم میں سزا ملی۔ اس مقدمے نے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی جوت جگائی تا آنکہ تحریک پاکستان اپنے شباب پر تھی۔ تو سندھ کا بچہ بچہ بٹ کے رہے گا، ہندستان کا نعرہ لگا رہا تھا۔ یہ فخر بھی سندھ اسمبلی کو حاصل ہوا کہ آئینی طور پر پاکستان کا ریزولیوشن سب سے پہلے اس اسمبلی میں پاس ہوا اور یہ عزو افتخار بھی سندھ کے نصیب میں لکھا گیا کہ پاکستان کا پہلا دارالحکومت عروس البلاد کراچی بنا دیا گیا بنا بریں اس برصغیر کے مسلمانوں کو ان کی کھوئی ہوئی عظمت واپس دلانے میں، جس رہبر عظیم کی کوششیں رنگ لائیں، وہ قائد اعظم محمد علی جناح تھے، جو اسی شہر میں تولد ہوئے اور یہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ان واقعات کی علمی، تاریخی اور بین الاقوامی حیثیت سے وادی مہران کی عظمت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے، جہاں آج شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی تہہ خاک استراحت فرما ہیں۔ ان کی ذات اقدس اس خطے کے لوگوں کے لئے ایک آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے جس کی کرنوں سے دور دور تک اجالے بکھر رہے ہیں۔ اجالوں کے اسی گہوارے کا نام میں نے "آفتاب مہران" تجویز کیا ہے اس میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حیات عظمت نشان کے زندہ نقوش ملتے ہیں۔ ان کے نظریۂ حیات، نظریۂ تصوف اور نظریۂ شعر کا پتا چلتا ہے۔ سندھ کے وہ قدیم رومان آویزۂ گوش بنتے ہیں، جو رنگ و آہنگ سے عبارت ہیں۔ شاہ عبداللطیف کی ابتدائی زندگی کیسی تھی؟ ان کا عقیدہ و مسلک کیا تھا؟ اور ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات کون سی ہیں؟؟ آفتاب مہران میں ان سب باتوں کا تفصیل اور استدلال سے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب باتیں تاریخ و تہذیب کے کئی پہلوؤں کو سموئے ہوئے ہیں۔

وادی مہران کی تاریخ صدیوں پرانی ہے اور یہاں کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ مصری اور عراقی تہذیبیں اسی کے ہم پلہ ہیں اور موہنجو داڑو، ٹیکسلا، وغیرہ کے آثار اس تہذیب کی قدامت اور عظمت دونوں کے شاہد ہیں۔ کسی علاقے کی تہذیب و معاشرت ملک میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے کیونکہ مختلف علاقائی تہذیبیں مل کر ہی ملکی تہذیب کو جنم دیتی ہیں اور جب تک کسی ملک میں یہ اتصال باہمی پیدا نہ ہو، وہاں نہ تو صحت مند تہذیب پرورش پا سکتی ہے اور نہ ہی زندہ معاشرے کی داغ بیل پڑ سکتی ہے اس لحاظ سے علاقائی تہذیب کو ملک کی تہذیبی اساس کی خشت اول قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ بالکل یہی حال سندھ کی تہذیب کا بھی ہے۔

علاقے پسماندہ بھی ہوتے ہیں اور ترقی یافتہ بھی، لیکن وہ علاقے ہمیشہ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ رہے ہیں۔ جن کی اپنی کوئی زبان نہ ہو یا جن کی زبان میں وسعت و کشادگی اور شائستگی کے جواہر ریزوں کی کمی ہو ان کے مقابلے میں وہ علاقے ذہنی بلوغت کے آئینہ دار ہوتے ہیں جن میں لسانی رہبر اور ریفارمر پیدا ہوتے رہیں اور جن کی زبان

کا کینوس وسیع ہو۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا دور بڑی حد تک تہذیب و تمدن اور لسانی اعتبار سے غیر ترقی یافتہ تھا۔ اس لیے انہوں نے سندھ کی تہذیب کو ترقی سے ہمکنار کرنے اور یہاں کے عوام کی ذہنی اصلاح کے لئے مختلف انداز اختیار کیے اور انہیں ہر طرح سے فیض پہنچایا۔ آفتاب مہران، اس لحاظ سے اس عہد اور اپنے ماضی اور مستقبل کی ایک مکمل تاریخ ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نام سے تو برصغیر کے سب ہی لوگ واقف ہیں، مگر وہ ان کے نظریات و افکار سے نابلد رہے ہیں۔ اس کی اغلباً وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے حالات اور ان کے کلام کو دوسرے لوگوں تک ان کی زبان میں پہنچانے میں بخل سے کام لیا گیا ہے۔ سندھی زبان چونکہ ایک علاقے کی زبان ہے اس لئے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے افکار پھیلانے کے لیے ایسی زبان میں ان کے تراجم ازبس ضروری ہیں، جو ایک علاقے سے خاص نہ ہوں، بلکہ ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ میں ادارہ شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز کے ڈائریکٹر جناب ارشد نیاز اور منیجر جناب رب نواز ملک کا ممنون احسان ہوں، جنہوں نے میری توجہ اس مسئلے کی طرف مبذول کرائی اور میں نے انہیں اپنا ہم خیال و ہم جلیس پایا۔ ادارہ کے یہ اہم ارکان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی سوجھ اور فکر علاقائیت سے بالاتر ہے اور وہ نشر و اشاعت کے معاملے میں بھی قومی نظریہ کو ہر حال میں فوقیت دیتے ہیں۔ میری ذاتی رائے میں اگر سندھی کی طرح پشتو، بلوچی اور پنجابی زبان و ادب کے شعراء اور بزرگان دین کو بھی اسی انداز میں قومی زبان میں شائع کیا جائے، تو یہ ملک و ملت کی بہت بڑی خدمت ہو گی، حقیقت میں ایک قومی ادارے کا یہی ایک فریضہ ہے۔ اس اقدام سے پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو فائدہ پہنچے گا۔

آخر میں، میں ان ارباب قلم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی اس موضوع پر تحریریں میرے قلب و ذہن میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عظمت کے نقوش ثبت کرتی رہیں۔ میں اپنے ان قلم نواز دوستوں میں سے جناب شیخ ایاز، جناب ابن انشاء، جناب رئیس امروہوی، جناب اختر انصاری اکبر آبادی۔ اور جناب اسمٰعیل خواجہ کا بطور خاص ممنون ہوں۔ اس وقت جب کہ میں آفتاب مہران کا مسودہ مکمل کر چکا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ بے حد یاد آ رہے ہیں، جنہوں نے آج سے تقریباً پانچ سال پہلے مجھے نہ صرف بھٹ شاہ میں شرف مہمانی بخشا، بلکہ شاہ عبداللطیف کے روضہ اقدس کے سامنے بیٹھ کر رات کی خنک اور پر نور فضاؤں میں مجھے ہالا سے حجاز تک تاریخ کے بہت سے اوراق بھی ازبر کرائے۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی دھڑکنوں اور میری سانسوں میں وہ جذبات و احساسات اب بھی موجزن ہیں، اور میں انتہائی ادب و احترام اور عقیدت و تکریم کے ساتھ یہ ارمغان عقیدت پیش کر رہا ہوں۔ ؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف

۹ شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ
بمطابق ۱۸/اگست ۱۹۷۵ء

ایم۔ ایس۔ ناز
۸۸۔ جلال پارک شام نگر چوبرجی۔ لاہور

لمحہ لمحہ زندگی

اے چاند
تم اپنی چودھویں رات کی تمام تر تابانیوں کے ساتھ
خواہ تم کتنی بھی کوشش کیوں نہ کرو
میرے محبوب کے جمال کی ایک کرن کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔
تم صرف رات کو چمکتے ہو
مگر میرا محبوب ہر وقت منور ہے
اے چاند
میں نے یہ حقیقت بیان کر دی ہے،
خواہ تم خوش ہو یا ناراض

یہ رنگ تغزل سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ہے۔ اس پیرایۂ غزل میں انہوں نے جو میٹھی میٹھی باتیں کی ہیں، ان کے مداح و پرستار اسی دلنشیں طرز تکلم میں خود انہیں یاد کرتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ انسان کی نشو و نما کی تعمیر میں خون صالح اور پاکیزگی حسب و نسب کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ان ہی صفات نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کو لازوال شہرت بخشی اور وہ دنیا کے عظیم اور واجب التعظیم فنکاروں میں شمار ہوتے آج انہیں ہر کوئی عقیدت کے جذبات میں سرشار ہو کر دیکھتا ہے۔

عقیدت کی آنکھ نہیں ہوتی، بلکہ دل ہوتا ہے۔ عقیدت چشم تصور سے دیکھتی نہیں، البتہ دل کے گداز سے سوچتی ضرور ہے۔ ہر کسی کو ہر کسی سے عقیدت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی عقیدت کا دل پر تسلط لمحاتی انداز میں ہوتا ہے۔ عقیدت بالکل نامعلوم، لاشعوری اور غیر مرئی طور پر اثر دکھاتی ہے اور قلب کو بتدریج مسخر کر لیتی ہے۔ بالخصوص فنکار سے عقیدت بہت معنی خیز اور حقیقت آفریں ہوتی ہے اس لئے کہ وہ دل کے تاروں میں اپنے افکار کی مضراب سے فردوسی جھنجھناہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ کچھ ایسی ہی عقیدت اردو اور سندھی جاننے والوں کو شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ہے۔

شاہ — فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ سندھی زبان میں اگر یہ لفظ استعمال کیا جائے تو اس سے مراد شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ہو گی اور جب "دریا شاہ" بولا جائے، تو اس کے معنی دریائے سندھ کے ہوں گے۔ ان ہی معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں شاہوں سے سندھ کے باسیوں کو برابر فائدہ پہنچا ہے۔ ایک شاہ سے قوت روحانی حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرے شاہ سے قوت جسمانی ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سندھی شاعری میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام نہ ہوتا، تو اسے وہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا، جس کی وہ اہل تھی۔ اور دریائے سندھ اس خطے میں نہ ہوتا، تو یہاں ایک موہنجو داڑو کی بجائے کئی موہنجو داڑو ہوتے اور پاکستان ان بیراجوں جھیلوں اور نہروں سے محروم رہتا جو اس خطے کا طرۂ امتیاز ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کو پھیلانے والے بادشاہ نہیں، بلکہ وہ بزرگان دین اور صوفیائے کرام تھے، جنہوں نے تلوار کی بجائے اپنی شیریں بیانی اور حسن و اخلاق سے لوگوں کے دلوں کو متاثر کیا۔ یہ وہ صوفی درویش تھے جنھیں اسلام سے بالعموم اور محمد عربیؐ سے بالخصوص عشق تھا۔ انہوں نے اپنے درس اور کلام سے علم و معرفت کے ایسے دریا بہائے کہ جن کی روانی دریائے سندھ سے بھی بڑھ گئی۔ اس خطے کے ہر کونے میں ان بزرگوں، صوفیوں اور درویشوں کے مزارات ہیں۔ یہ مزارات ہر وقت مرجع خلائق بنے رہتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مزار بھی حیدرآباد سے ۳۲ میل کے فاصلے پر بہ جانب شمال بھٹ شاہ میں واقع ہے۔

بھٹ شاہ کی تاریخ

آج سے تقریباً دو سو چونتیس برس قبل ۱۷۴۱ء میں شاہ عبداللطیف نے جس ریت کے ٹیلے کو اپنی خلوت، سکونت اور عبادت کے لئے پسند کیا، وہ چاروں طرف سے جھاڑ جھنکاڑ سے گھرا ہوا ایک جنگل نما مقام تھا۔ ٹیلہ کے قریب نشیبی علاقہ میں بارش کا پانی جمع ہو کر چھوٹی سی جھیل بن جاتا تھا، جسے "کراڑ" کہتے تھے۔ شاہ عبداللطیف ابتدا میں اپنے چند فقراء کے ہمراہ یہیں سکونت پذیر ہوئے۔ اور انہوں نے خود اپنے دست مبارک سے مٹی ڈھو ڈھو کر ٹیلے پر ایک مکان اور مسجد تعمیر کی۔ فقراء نے اپنے لیے گھاس پھونس کے جھونپڑے بنالیے اور اس طرح ایک شہرہ آفاق بستی کی بنا ڈالی۔ سندھی زبان میں چونکہ ٹیلے کو بھٹ کہتے ہیں۔ اس لئے یہ جگہ "شاہ جی کی بھٹ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اب فقراء کی یہ بستی ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور اسے "بھٹ شاہ" کہتے ہیں۔ کراچی سے شمال مشرق کی جانب اس کا فاصلہ ۱۵۴ میل اور ہالا شہر سے اس کا فاصلہ جنوب مشرق کی جانب ۵ میل ہے ۱۹۶۵ء کی مردم شماری کے مطابق بھٹ شاہ کی آبادی ۲۸۹۱ تھی، جب کہ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق اس کی آبادی اندازاً چھ ہزار ہے، رقبہ چار مربع میل ہے بھٹ شاہ کا ریلوے سٹیشن بھی ہے اور پولیس سٹیشن اور پوسٹ آفس بھی۔

سوانح شاہ عبداللطیف

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے حالات زندگی کی چھان بین کی جائے، تو معلوم ہوگا کہ ان کی تاریخ ولادت اور وفات کے سلسلے میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر شاہ عبداللطیف آف بھٹ کے مصنف سورلے اور مولانا غلام رسول مہر مولف تاریخ سندھ، ڈاکٹر گوربخشانی، مرزا قلیچ بیگ اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے حالات زندگی کی ترتیب و تدوین میں خاص کاوش سے کام لیا ہے۔ سورلے کا کہنا ہے:

"شاہ عبداللطیف بھٹائی کو مغلیہ اور کلہوڑہ دور حکومت دیکھنے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے سنہ پیدائش و وفات سے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس کی اغلباً وجہ یہ ہے کہ ان کے دور کی تاریخ اعتماد کے ساتھ نہیں بتائی گئی، تاہم ۱۷۵۲ تا ۱۶۸۹ء کے درمیانی عرصے سے بہت سے لوگ متفق ہیں۔"

اس اقتباس اور چند دوسری تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں پیدا ہوئے۔ روایت کے مطابق ۱۶۸۹ اور ۱۶۹۰ء کو مستند قرار دیا جاتا ہے، مولانا غلام رسول مہر کے بقول:

"شاہ عبداللطیف کی ولادت بارہویں صدی ہجری کے عین آغاز میں ہوئی۔ عوام کے عقیدے کے مطابق صدی کے عین آخر پر مجدد پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کو بہ اصطلاح معروف کوئی مجدد مانے یا نہ مانے، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے شاعری سے سندھی زبان کو زندہ کر دیا۔"

شاہ عبداللطیف کا عہد دراصل دو زمانوں کے عروج و زوال کی داستان دہراتا ہے۔ انہوں نے سندھ میں مغلیہ تسلط کو کمزور اور سندھ کو دلی کی حکومت کے جوئے سے آزاد ہوتے دیکھا، گو ان کے اس زمانے کا تعین وثوق کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا، تاہم روایت کے مطابق یہ زمانہ ۱۶۸۹ء سے ۱۷۵۲ء تک کا ہے۔ ان کا زمانہ حیات وہی ہے، جب سندھ میں حکومت مغلوں کے ہاتھ سے نکل کر کلہوڑوں کے قبضے میں آئی انہوں نے اس ماحول میں آنکھ کھولی، جب مغلیہ سلطنت زوال سے ہمکنار ہوتی تھی۔ ایک اعتبار سے یہ حشر آفریں دور تھا۔ حکومتوں کو ثبات نہ تھا ہر دو تین سال کے بعد ایک انقلاب نو برپا ہو جاتا تھا۔ غریب عوام ظلم و استبداد کا شکار تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا تو شاہ عبداللطیف بھٹائی کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ کلہوڑہ خاندان کا پہلا حکمران سندھ میں زور پکڑ رہا تھا، تو وہ عین عالم شباب میں تھے۔ اس وقت دہلی میں قتل عام ہو رہا تھا۔ شاہ عبداللطیف کی عمر پچاس سال تھی، جب نادر شاہ نے دلی کو لوٹا، برباد کیا۔ اور جب سندھ کو ایران کا باجگزار بنایا گیا، تو ان کی عمر پچاسی سال تھی۔ پھر احمد شاہ ابدالی نے دلی میں چراغ آخر شب کی مانند سسکیاں لیتی ہوئی مغلیہ حکومت پر حملہ کیا تو موجودہ افغانستان کی بنیاد رکھی گئی اور سندھ کابل کی حکومت کے زیر نگین آگیا۔ اس پر آشوب دور کے پانچ سال کے بعد شاہ عبداللطیف بھٹائی انتقال کر گئے۔ تب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے قدم جمانے شروع کر دیئے تھے۔

شاہ عبداللطیف بظاہر ساری زندگی سیاسی انقلابات سے بیگانہ رہے۔ انہوں نے درباری سازشوں اور ریاستی جنگوں میں کبھی دلچسپی نہ لی اور نہ ہی اپنی شاعری کو ان وقتی حادثات سے متاثر ہونے دیا۔ پھر ان کا کلام اس دور کے سندھ اور سندھی عوام کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ حقیقت میں ایک درویش تھے جن کے دل میں ہر شخص کا دکھ درد موجود تھا۔ وہ ایک صوفی تھے اور خالق اور مخلوق کے درمیان حائل تمام حجابوں کو اٹھا دینا چاہتے تھے۔ وہ ایک شاعر تھے۔ جن کے نغمے الہامی تھے۔ اور جن کے گیتوں میں ماں کی ممتا اور محبوب کے پیار کی لذت تھی۔ ان کی زندگی تصوف اور شعریت کا ایک حسین امتزاج تھی۔ انہیں سندھ کے شعرائے متاخرین میں سے اہم اور نمایاں مقام حاصل ہوا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مستند حالات دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے متعلق تمام تر معلومات کا انحصار ان روایات پر ہے جو گذشتہ دور کے اواخر تک زندہ لوگوں کی زبانوں پر تھیں۔ ان لوگوں نے اپنے بزرگوں سے یہ روایات سنیں اور پھر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی گئیں۔ کہیں کہیں ان روایات پر عقیدت مندی کا رنگ غالب آتا چلا گیا اور یوں شاہ صاحب کے حالات زندگی مستور ہوتے گئے۔ بہر کیف ان روایات سے قطع نظر مرزا قلیچ بیگ کا لکھا ہوا تذکرہ سب سے زیادہ قرین صحت گردانا جاتا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق شاہ عبداللطیف ۱۶۸۹ء میں سندھ کے ایک گاؤں ہالا حویلی میں پیدا ہوئے اور آپ کا پورا نام شاہ عبداللطیف بن سید حبیب بن سید عبدالقدوس بن سید جمال بن سید شاہ کریم ہے۔ آپ کا تعلق مٹیاری کے کاظمی سیدوں کے گھرانے سے تھا اور یہ سلسلۂ نسب ہرات کے سیدوں سے جا ملتا ہے۔

عقیدہ و مسلک

ایک روایت ہے کہ شاہ عبداللطیف سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ میں شیعہ اور سنی فرقے کے درمیان ہوں۔ ڈاکٹر سورلے کی تحقیق یہ ہے کہ شاہ صاحب شیعہ تھے، جب کہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ آپ سنی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبداللطیف شیعہ تھے نہ سنی تھے وہ ایک سید تھے سادے اور سچے مسلمان تھے اور فرقہ پرستی سے انہیں نفرت تھی۔ اسلام ہی ان کا عقیدہ اور اسلام ہی ان کا مسلک تھا۔ یہی صوفیائے کرام کا مذہب بھی ہے کہ وہ نیکی کی راہ میں حق کی تلقین اور رشد و ہدایت کے لئے مخلوق خدا

کوفرقوں میں تقسیم نہیں کرتے۔

شاہ عبداللطیف کی ابتدائی زندگی ہالا حویلی میں گزری۔ کچھ دنوں بعد آپ اپنے والد کے ہمراہ کوٹڑی چلے آئے اور جوانی کازمانہ یہیں گزارا۔ ان کے عادات و اطوار عام سیدوں سے جداگانہ تھے۔ سیدوں کے بااثر خاندان اور دنیاوی جاہ وحشم پر دسترس رکھنے کے باوصف انہوں نے بے نیازی کے عالم میں جوانی کی زندگی بسر کی۔ انہیں شروع ہی میں ایسا ماحول نصیب ہوا جس نے ان کی شخصیت اور فکر کو جلا بخشی۔ ان کے والد شاہ حبیبؒ متمول ہونے کے باوجود منکسر المزاج تھے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ رقمطراز ہیں۔

"شاہ صاحب کی ابتدائی زندگی اپنی والدہ کی شفقت اور محبت میں گاؤں ہی میں گزری۔ اس لیے حسب ونسب کے بدلے اخلاق اور نیکی دولت کے بدلے عزبت مگر عزت و شرافت بڑے شہروں کے مقابل گاؤں اور جھونپڑوں سے محبت، خواص کے بدلے عوامی زندگی سے ہمدردی اور محبت کو ترجیح دینے کا جذبہ اور احساس شاہ صاحب کی شخصیت میں رچ بس گیا۔"

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ معزز اور اعلیٰ خاندانوں میں بچپن ہی سے تربیت کے زریں اصول عملاً پیش نظر رکھے جاتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے بزرگوں نے بچپن ہی میں اپنے چشم وچراغ کے درخشندہ تیوروں کا اندازہ کرلیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تربیت اور ماحول کا خاص طور پر خیال رکھا گیا۔ بنابریں ان کی طبیعت میں نیکی اور رحم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بات چیت میں نرمی اور شیرینی اور ذاتی معاملات میں عجز وانکساری ان کی فطرت تھی۔

سیر و سیاحت

شاہ عبداللطیف، انسان دوستی، منکسر المزاجی، نرم دلی، شگفتگی اور شرافت کی زندہ مثال تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم والد بزرگوار کے زیر سایۂ حاصل کی اور جلد ہی تصوف کی طرف مائل ہوگئے۔ مثنوی مولانا رومؒ سے ان کو خاص شغف تھا اور یہ کتاب دراصل ان کے باطنی کمالات میں بھی معاون ثابت ہوئی۔ تصوف کے اس ذوق نے انہیں سیاحت کے لئے آمادہ کیا۔ مختلف مکاتیب ذکر وفکر کے صوفیہ سے ارتباط و اختلاط بھی اسی ذوق کا سبب رہا۔ انہوں نے لسبیلہ، مکران، کچھ، کاٹھیاواڑ، جیسل میر اور ملتان کی سیر و سیاحت کی اور اپنے وقت کے مشہور اولیائے کرام سے مستفیض ہوئے۔ سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ ان کا قلب و ذہن زمانے کی تلخیوں سے بھی آشنا ہوا۔ محققین کی رائے میں شاہ عبداللطیف باقاعدہ تحصیل علم کی منزلوں سے نہیں گزرے اس کے باوجود وہ صاحب فہم وادراک تھے۔ انہیں علم وعمل سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ علم کی لگن اور عمل کی جستجو رکھتے تھے۔ اکثر علمی کتابوں کا مطالعہ کیا، مگر لکھنا نہیں سیکھا۔

اپنی سیاحت کے دوران شاہ عبداللطیف نے ہر طبقہ کے لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ غریب دیہاتیوں، کاریگروں، کسانوں، گلہ بانوں کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے مخفی نہ رہا۔ ہندو اور مسلمان مذہبی شخصیتوں کی صحبت اور ان کے مطالعہ نے شاہ صاحب پر مذہبی رسومات کے تصنع اور کھوکھلے پن کو واشگاف کردیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خالق اور مخلوق کی محبت سے عظیم کوئی طاقت اور قوت نہیں اور یہی اصل مذہب ہے۔ ان ہی ہمہ گیر مشاہدات نے ان کی زندگی کو عمل کے سانچے میں ڈھالا اور ان کے افکار میں وسعت پیدا کی۔

اساتذہ کرام

بعض کتب سے پتا چلتا ہے کہ شاہ عبداللطیف کے پہلے استاد آخوند نور محمد تھے۔ ان کے علاوہ کئی اساتذہ سے بھی درس لیا۔ ڈاکٹر ٹرمپ کا بیان ہے کہ شاہ عبداللطیف ان پڑھ نہیں تھے۔ اس دعوے کو رد کرنے کے لیے ان کا دیوان ہی ثبوت کے طور پر پیش کرنے کے لئے کافی ہے جس میں انہوں نے عربی اور فارسی زبانوں کے مشکل سے مشکل الفاظ اور محاورات شامل کیے ہیں۔ دین محمد وفائی 'لطف اللطیف' میں لکھتے ہیں۔

"شاہ صاحب نے پہلے ہی دن جب الف کے بعد ب، پڑھنے سے انکار کر دیا تو آپ کے استاد نور محمدؒ آپ کو شاہ صاحب کے والد سید حبیب کے پاس لے گئے اور ساری حقیقت کہہ سنائی۔ اس پر باپ نے بیٹے کی روح میں جلتا ہوا حق پرستی کا چراغ دیکھ لیا۔"

ڈاکٹر گوربخشانی کا خیال ہے کہ شاہ عبداللطیف نے کسی قدر درسی تعلیم حاصل کرکے، کس قدر اپنے تجربات اور مطالعہ کے ذریعے اپنے علم کو بڑھایا اور علم میں مہارت حاصل کی۔ عربی اور فارسی کے آپ عالم تھے۔ اور اپنی مادری زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ بلوچی، سرائیکی، ہندی، پنجابی اور دوسری علاقائی بولیوں سے بھی آشنا تھے۔ شاہ صاحب فارسی زبان میں مراسلت کرتے تھے۔ اس کا بیّن ثبوت آپ کا وہ خط ہے۔ جو آپ نے حضرت مولانا معینؒ کو اویسی عقیدہ کے سلسلہ میں کچھ معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھا تھا۔

سلسلہ نسب

حضرت شاہ عبداللطیف قادری، سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا ذکر میر عبدالحسین خاں سانگی نے 'لطائف لطیفی' میں بھی کیا ہے۔ انہوں نے شاہ صاحب کے سلسلے کو یوں مربوط کیا ہے۔

"سید عبداللطیف شاہ از والد شریف خود سید حبیب شاہ از پدر خود سید عبدالقدوس شاہ از والد خود سید جمال شاہ از والد خود سید عبدالکریم شاہ از سلطان احمد بہاری از احمدؒ از شاہ علی ہاشمی از شاہ شرف الدین احمد از شاہ شہاب الدین قاسم از بدر الدین یحییٰ از ظہیر الدین احمد از شاہ شہاب الدین احمد از شاہ عماد الدین صالح ابو نصر از مرشدی افضل المشائخ شاہ عبدالرزاق وھو من ید مرشدی حضرت پیر دستگیر ابو محمد سید عبدالقادرؒ۔"

یہ بھی مشہور ہے کہ شاہ عبداللطیف نے اویسی طریقہ سے حضرت نبی کریمؐ سے روحانی ارشاد پایا جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے، جو آپ نے ٹھٹھہ کے مشہور عالم اور بزرگ مخدوم محمد حسینؒ کو لکھا یہ خط اور مخدوم محمد حسینؒ کا جواب 'رسالہ اویسیہ' کے نام سے مشہور ہے۔

حلیہ مبارک

شاہ عبداللطیف کے حلیۂ مبارک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ آپ کے چہرے سے ہر وقت سنجیدگی اور گہری فکر کے آثار نمایاں رہتے تھے۔ چلتے وقت عصا آپ کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں عموماً کاسہ رکھتے تھے۔ اسی کاسہ میں پانی پیتے اور اکثر اوقات اسی میں کھانا کھاتے۔ ایک ہی برتن میں کھانا پینا ان کی قناعت پسندی کی دلیل تھا۔ ان کا کاسہ اور عصا نوادرات میں شامل ہیں جو اب تک محفوظ چلے آرہے ہیں۔ آغا تاج محمد نے شاہ صاحب کے ظاہری حسن وخوبی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے۔

"چہرہ شکیل وجمیل، سرو قد، سینہ کشادہ، اور بازو سڈول اور مضبوط تھے۔ قوت اور ہمت لامحدود تھی۔ ریش مبارک چوکور اور بھری ہوئی گندمی

رنگ سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں، شراب طہور کے نشے میں ہر وقت مخمور رہتی تھیں۔ گویا دو شمعیں روشن تھیں۔ پیشانی درخشاں تھی اور پیرانہ سالی میں بھی آپ کے روئے مبارک سے نور برستا تھا۔ خلقِ خدا پر بذاتِ خود خلیق و شفیق تھے۔ کبھی کسی کو ایذا نہیں پہنچاتے تھے۔ سادگی پسند تھے۔ اور شاہانہ شان و شوکت سے گریز کرتے تھے"۔

شاہ عبداللطیف کی انسان دوستی اور دردمندی کا زمانہ معترف تھا۔ ان کی شادی اسی انسان دوستی اور دردمندی کی مظہر تھی۔ انہوں نے کوٹڑی کے رئیس مرزا مغل بیگ کی لڑکی سے شادی کی۔ مرزا مغل بیگ ۱۷۱۳ء میں جب ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹنے کے بعد قتل ہوئے تو ان کی یتیم اور غمزدہ بیٹی پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ شاہ صاحب نے اس یتیم اور غمزدہ لڑکی سے شادی کر کے ایک خوشگوار فرض ادا کیا اور اپنے قول و فعل کی یگانگت کو سچ ثابت کر دکھایا۔

سندھی زبان کے عظیم شاعر ہونے کے باوجود شاہ عبداللطیف کا ناطہ اردو کے بہت قریب تھا۔ ان کے بزرگ امیر تیمور کے عہد میں اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اس لحاظ سے آپ کا تعلق جاط متعلوی سیدوں سے بہت قریبی تھا۔ آپ کے خاندان کے ایک بزرگ ہاشم شاہ مٹیاری سادات کے سردار تھے۔ مٹیاری خاندان اب تک چلا آرہا ہے۔ اور وہ خاندان بھی زندہ ہے جس کا سلسلہ نسب شاہ صاحب قبلہ سے ملتا ہے۔ سید ہاشم شاہ گوناگوں صفات کے حامل تھے۔ وہ اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور بالعموم اردو ہی بولتے تھے۔ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا خاندان اردو کے بہت قریب تھا۔ خود شاہ صاحب نگری نگری قریہ قریہ سفر کر کے اپنا فیض عام پہنچاتے رہے۔ ان کا سفر، سفرِ وسیلہ ظفر تھا۔ وہ عمر بھر اپنے عقیدت مندوں کو اپنے روحانی فیض کے توسل سے نیکی، اعتماد، ہمت اور پاکیزگی کی دولت سے مالا مال کرتے رہے۔ سورلے کے بقول "شاہ صاحب ہر روز کافی کافی دور تک پیدل سفر کرتے تھے۔ تقریباً سارا سندھ انہوں نے پیدل ہی گھوم پھر کر دیکھا اور لوگوں کو ایمان کی دولت لٹائی۔ وہ اگر ہالا حویلی یا مٹیاری تک ہی اپنی زندگی کو محدود رکھتے تو شاید ان کی شاعری میں بھی اس قدر وسعت پیدا نہ ہو سکتی۔

مقبرہ شاہ بھٹائی

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ۱۴ صفر المظفر ۱۱۶۵ھ کو وفات پائی۔ آپ کو آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے والد بزرگوار شاہ حبیب کے مقبرہ کے جنوب میں دفن کیا گیا۔ روایت ہے کہ جس روز شاہ صاحب نے انتقال فرمایا۔ اسی روز ان کے کئی مرید اور عقیدت مند اس صدمہ جانکاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گئے۔ یہ روایت بہت حد تک قرینِ صحت اور مستند معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں بھی آج کی طرح شاہ عبداللطیف سے عقیدت والہانہ عوام کا مسلک اور ایمان بن چکی تھی۔ آج بھی سندھ کا بچہ بچہ آپ کے نام کا والہ و شیدائی ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر ہزاروں ہی نہیں لاکھوں افراد کا اجتماع ہوتا ہے۔ اس میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی۔ غرض سندھ کے گوشے گوشے سے لوگ عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لیے بھٹ شاہ میں شاہ کے مزار پر جمع ہوتے ہیں۔ ہر حاضری کے وقت ان کے دلوں کی امنگیں اور ترنگیں تازہ ہوتی ہیں اور وہ شاہ عبداللطیف کا نام اور ان کا کلام سنتے ہی دیوانہ وار جھوم جھوم جاتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقبرہ سندھ کے سابق حاکم میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے ۱۱۶۷ھ میں تعمیر کرایا، جو کہ کلہوڑہ دور کے فنِ عمارت سازی کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ مقبرہ کاشی کی اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور اپنے دور کے نامور معمار عیدن نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ شاعرِ وقت محمد پناہ رجا نے شاہ عبداللطیفؒ کی یہ تاریخ وفات فارسی میں کہی جو روضہ مبارک کے مشرقی دروازہ پر منقش ہے۔

گفت ایں رجا، مرید سنِ ارتحال پیر
گردیدہ محو عشق وجودِ لطیف میر!
زد نعرہ در فراق و گر کردہ سینہ چاک
گشد محو در مراقبہ جسم لطیف پاک"

مقبرے کا دروازہ صندل کی لکڑی کا بنا ہوا ہے جس پر چاندی کی چادر چڑھی ہوئی ہے۔ روضے میں داخل ہوتے ہی سامنے شاہ عبداللطیف کے مزار کی جھلک لکڑی کی حسین جالی کے اندر نظر آتی ہے۔ روضے کی بیرونی دیواروں کو کاشی گری پتھروں سے مزین کیا گیا ہے۔ مقبرے کے سامنے صحن پھیلا ہوا ہے، جس میں سنگ مرمر کا فرش بنا ہوا ہے۔ مقبرے کی چار دیواری کے باہر ایک وسیع ایوان ہے۔ اس کے درمیان لوہے کے جنگلے میں سماع کا الاؤ قائم ہے۔ ہر ماہ کی چودھویں رات اس الاؤ کے گرد فقرا کا اجتماع ہوتا ہے۔ روضہ کے مغربی سمت، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے پہلے خلیفہ سید جمال شاہ کا مزار ہے۔ روضہ کی چار دیواری کے اندر جنوب مشرقی کونے میں بعد کے دو سجادگان سید لطیف علی شاہ اور سید علی بخش شاہ عرف الن سائیں کے مزار ہیں۔

اس وقت درگاہ شریف پر پہنچنے کے لیے تین گزرگاہیں ہیں۔

- جنوب سے :- تالاب کراڑ کے کنارے، سواری سے اتر کر چڑھائی سے درگاہ شریف تک۔
- مشرق سے :- نوبت خانہ کی سمت سے بازار کی جانب نکلتی ہوئی تنگ گلی سے پیدل۔
- شمال سے :- ریلوے لائن کے مقابل کھلے میدان سے بھی ایک راستہ درگاہ کو آتا ہے، لیکن اس راستے سے آمد و رفت بالعموم بہت کم رہتی ہے۔

درگاہ کے مشرق میں کاشی کی اینٹوں سے تعمیر کی گئی ایک عظیم الشان مسجد ہے جو شاہ صاحب کے نام نامی اسم گرامی سے منسوب ہے۔ شاہ عبداللطیف نے بھٹ پر آنے کے بعد سب سے پہلے یہی مسجد بنوائی تھی۔ جو پہلے کچی اینٹوں کی تھی۔ بعد میں اسے پختہ کر دیا گیا۔ یہ مسجد ابتدا میں محض اندرونی ایوان کی اراضی پر مشتمل تھی، بیرونی صحن کا اضافہ بعد میں کیا گیا۔ تالپور حکمرانوں کی پہلی چوپاری کے دوسرے یار میر نصیر خان نے ۱۸۳۵ء میں اس مسجد کی مرمت کرائی۔ ساتھ ہی مقبرے کی خوبصورتی میں بھی اضافہ کیا۔ میر نصیر خان کے بڑے بھائی میر نور محمد خان نے درگاہ کے سامنے بڑے صحن میں واقع کنویں کی مرمت کرائی اور اس کے چچازاد بھائی میر محمد خان نے روضہ کے لئے صندل کا دروازہ بنوایا اور اس پر چاندی کے پترے چڑھوائے، جو اب تک موجود ہیں۔ مسجد اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اس میں کم و بیش ایک ہزار بندگانِ خدا نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کی جنوبی دیوار پر میاں محمد پناہ رجا کا یہ قطعہ مرقوم ہے۔

شاہ صاحب ذوالمناقب سیدی عبداللطیف
آنکہ قطبِ وقت خود بود ست در مردانِ حق
چوں ز جامِ ارجعی مخمور نوشِ وصل شد
گفت ملہم غیب رحلتش "رضوانِ حق"

مزار کے قطعے "شد محو در مراقبہ حرم لطیف پاک" اور مسجد کے مذکورہ قطعے کے "رضوان حق" سے ۱۱۶۵ اعداد نکلتے ہیں جو کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا سن وفات ہے ۔

بھٹ پر آنے کے بعد شاہ صاحب نے اپنے اور اپنی جماعت کے لئے جو کنواں کھدوایا تھا وہ اب بھی موجود ہے ۔ اس کنویں کی ایک خصوصیت عجائبات میں شمار کی جاتی ہے کہ زمین سے اتنا بلند واقع ہونے کے باوجود اس میں پانی کی سطح ٹیلے کی نیچے والی زمین سے کافی بلند نظر آتی ہے ۔

شاہ عبداللطیف کے سجادہ نشینوں نے بڑے صحن کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک کشادہ لنگر خانہ تعمیر کروایا اور سبیل بھی قائم کی ۔ اس لنگر خانے کی وقتاً فوقتاً مرمت ہوتی رہی اور یہ لنگر خانہ آج بھی فقراء اور زائرین کے لیے بطور مسافر خانہ استعمال ہوتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے کچھ عرصہ تک یہاں بھی سماع کی محافل منعقد کی تھیں ۔

ایوان کے مشرقی حصے میں نوبت خانہ قائم ہے، جس میں بڑے بڑے نقارے موجود ہیں ۔ یہ نقارے سندھ کے حکمرانوں نے عقیدت کی وجہ سے نوبت خانے کو دیئے تھے یہ نقارے عرس کے موقع پر بجائے جاتے ہیں ۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے روضہ کے مغرب اور جنوب میں ایک مختصر قبرستان ہے ۔ اس میں بہت سے صاحب دل صوفی فقراء اور اس دور کے صاحب ثروت مدفون ہیں ۔ ان میں ہز ہائینس میر عبدالحسین خان سانگی، شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ اور شاہ صاحب کے بڑے معتقد رفیق تمر فقیر قابل ذکر ہیں قبرستان سے ملحق جنوب کی جانب تمر فقیر کا تکیہ بھی ہے تمر فقیر درحقیقت شاہ صاحب کے تمام فقراء میں بڑے رتبے کے حامل تھے ۔ انہوں نے ہی شاہ صاحب کے کلام کو انتہائی محنت، محبت اور عقیدت سے محفوظ کیا ۔ ان کا جمع کیا ہوا کلام آج بھی موجود ہے اور تبرکات میں شمار کیا جاتا ہے ۔

مزار شاہ عبداللطیف کے قریب ایک ثقافتی مرکز قائم ہو چکا ہے ۔ شاہ صاحب محض علاقائی شاعر نہ تھے ۔ ان کے کلام کی عالمی شہرت کا اندازہ لگاتے ہوئے سابق حکومت سندھ نے ایک کمیٹی تشکیل کی، جس نے ۳۵ لاکھ ۵ ہزار ۳۴ روپے کی لاگت سے "شاہ عبداللطیف بھٹ شاہ کلچرل سنٹر پروجیکٹ" کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا ۔ اس پروجیکٹ کا سنگ بنیاد اس وقت کے وزیر اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو رکھا ۔ اس ثقافتی مرکز میں ریسٹ ہاؤس' آڈیٹوریم' دارالمطالعہ کتب خانہ' عجائب گھر، موسیقی کی درسگاہ' اور طالب علموں اور صحافیوں' ادیبوں اور دانشوروں کی اقامت گاہیں شامل ہیں ۔ یہ ساری عمارات مشرقی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہیں ۔ پاکستان اور بیرونی ممالک کے سیاح اور معزز مہمان کثیر تعداد میں اس عظیم شاعر کے مزار پر حاضری دینے آتے ہیں ۔ تو ثقافتی مرکز سے ملحق ہوسٹل میں ٹھہرتے ہیں، جہاں ان کا شایان شان استقبال کیا جاتا ہے ۔ سندھ کے لوگ ویسے بھی بڑے مہمان نواز ہیں ۔ وہ ہوسٹل میں قیام کرنے والوں کی میزبانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے ۔

ثقافتی مرکز کے قیام کے بعد بھٹ شاہ' گاؤں کافی ترقی کر رہا ہے ۔ یہاں سب سے پہلے صوبائی شاہراہ سے گاؤں تک دو میل لمبی اور پکی سڑک تعمیر ہوئی ۔ ۱۹۶۲ء میں واپڈا نے اس گاؤں کے لیے بجلی مہیا کی اور بعد ازاں ٹیلی فون کی سہولت بھی بہم پہنچا دی گئی ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار کے متصل صحن میں ہفتے میں دو بار محفل طرب منعقد ہوتی ہے ۔ اس محفل میں سندھ کے ممتاز گلوکار اور سازندے مختلف سروں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام سناتے ہیں ۔ یہ نظارہ بڑا دیدنی ہوتا ہے ۔ محفل طرب نماز عشاء کے بعد شروع ہوتی ہے اور تہجد کے آخری وقت تک رہتی ہے رات کے مکمل اور پرسکوت ماحول میں شاہ کی کافیاں دلوں پر بے پناہ اثر کرتی ہیں اور ان کی حیات عظمت نشان کے کئی نقوش ذہنوں پر مرتسم ہو جاتے ہیں ۔ بھیرو رنگ و آہنگ کے ماحول میں جب نظریں صندلی جالی سے شاہ صاحب کی تربت سے ٹکراتی ہیں ۔ تو سرہانے کی جانب پڑے ہوئے پستی رنگی عمامے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاہ عبداللطیف بھٹائی زندہ ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے آرام فرما رہے ہیں ۔

شاہ جو رسالو

تیرے اک اک شعر میں مضمر ہے تاثیر فسوں
جس کو سن کر آتش شوق اور ہوتی ہے فزوں
رفتہ رفتہ بڑھتا ہے درد جگر سوز دروں !
نیند آتی ہے خرد کو جاگ اٹھتا ہے جنوں !
مست و بیخود ہوتے ہی تکمیل پا جاتا ہے عشق
حسن کی بزم طرب میں جھوم کر آتا ہے عشق

شاہ عبداللطیف بھٹائی کو ان کے ایک عقیدت مند نے جس خوبصورت پیرایہ میں خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ اس سے ان کے کلام کی ندرت اور عظمت ہویدا ہو جاتی ہے شاہ صاحب کا سارا کلام ایک رسالہ میں محفوظ ہے ۔ یہ کلام تمام تر سندھی زبان میں شاعری کی قدیم صنف 'دوہے' میں ہے'، جو رسالے کے نام سے منسوب ہے ۔ سندھی زبان میں رسالہ کے معنی 'پیغام' کے ہیں اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام بھی درحقیقت ایک پیغام ہے، جس کے ذریعے زندگی کے مختلف مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے جس طرح سندھی میں 'شاہ' کے لفظ سے مراد شاہ عبداللطیف بھٹائی ہوتی ہے ۔ اسی طرح رسالہ سے مراد شاہ کے کلام سے ہوتی ہے ۔ ڈاکٹر این میری شمل رقمطراز ہیں کہ سندھی زبان میں پہلے بھی صوفیانہ شاعری موجود تھی، لیکن شاہ عبداللطیف نے اپنے رسالہ میں ایسی پر اثر شاعری پیش کی، جسے فن کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ بلاشبہ ان کی اس کاوش کو تاریخ زبان و ادب ہمیشہ سراہتی رہے گی، شاہ صاحب نے اپنے رسالہ کی بدولت سندھی زبان کو بھی مالا مال کیا ۔

سندھی زبان کی قدامت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ ایک قدیم زبان ہے، جس میں الفاظ کی دولت کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے ۔ اختر انصاری اکبر آبادی کے بقول' اس کی جھولی میں کھرے سکوں کی کمی نہیں ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم زبان مثلاً سنسکرت' پراکرت' عربی' فارسی' بلوچی' پشتو' پنجابی زبان سے اس کا رشتہ رفیقانہ رہا ہے ۔ مروت اور اخوت اس زبان کا خاصا ہے ۔ یہ زبان بہت سی زبانوں سے قدیم ہی نہیں ۔ بلکہ قدیم تر ہے اور پھر شاہ صاحب نے تو اس زبان کو الفاظ اور خیالات کی دولت سے اتنا سرمایہ دار بنا دیا ہے کہ بڑے سے بڑے بینک کے سکے ختم ہو سکتے ہیں ۔ مگر اس زبان کے ذخیرے میں کبھی کمی نہیں آ سکتی ۔

سندھی زبان پر طائرانہ نظر

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی قدر و منزلت اور عزت و توقیر سندھیوں کے دلوں میں اس لیے بھی زیادہ ہے کہ انہوں نے اپنے افکار کی بدولت 'سندھی ایسی قدیم اور محدود سطح پر بولی جانے والی زبان کو جدید اور ایک ترقی یافتہ زبان بنا کر اس کا حلقہ تعارف مزید وسیع کر دیا ۔ سندھی زبان کی ایک خصوصیت تو ایسی ہے جو کسی دوسری زبان میں نہیں مل سکتی ہے یہی خصوصیت اسے دوسری زبانوں

سے بہرہ گیر گئی ہے۔ سندھی زبان نے ثقافت اسلامیہ کا اثر سب سے پہلے قبول کیا یہی وجہ ہے کہ عربی کے الفاظ کا ایک ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے۔ یہ عربی الفاظ اس زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ بنابریں سندھی زبان کا رسم الخط بھی عربی ہے اور تذکیر و تانیث کا استعمال بھی عربی قواعد کے مطابق ہوتا ہے اردو داں طبقہ کے لئے اس کا پڑھنا اور لکھنا قدرے دشوار نہیں۔ سندھی زبان کی اسی خصوصیت نے اسے ایک ایسی زبان بنا دیا ہے جس کے لہجے میں تقدس کا رنگ جھلکتا ہے، اور جو ہر مسلمان کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔

کرۂ ارض کے مسلمان، خواہ وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھتے ہوں اور کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔ رنگ و نسل اور لباس کے تمدنی اختلافات سے قطع نظر ان میں ایک ہی گہرا رشتہ ہے اور وہ ہے عربی زبان کا، کہ جس میں مسلمانوں کی عظیم اور مقدس ترین کتاب قرآن حکیم نازل کیا گیا۔ اس اعتبار سے یہ زبان صوفیائے کرام کے بھی بہت زیادہ قریب رہی یا صوفیائے کرام اس کے بہت قریب رہے اور انہوں نے اسے حرز جان بنایا وادیٔ مہران میں صوفیائے کرام نے تصوف اور اسلام کی سب سے زیادہ خدمت کی۔ اسلام اسی راستے سے برصغیر پاک و ہند میں پہنچا۔ ان حالات میں عربی کے اثرات پیدا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے عظیم صوفی شاعر نے اسی زبان کو اظہار ابلاغ کا ذریعہ بنایا، جو عربی زبان کا پرتو تھی۔

انگریزوں کے دور اقتدار میں ہندوؤں کے عروج اور اثر کے باعث کچھ ہندی الفاظ بھی اس زبان میں شامل ہوئے۔ مگر ان الفاظ کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سندھی زبان میں عربی کا پرتو ملتا ہے، تو پھر اس نے ہندی زبان کے الفاظ کیوں قبول کیے؟ اس کا جواب سیدھا سادہ اور آسان ہے اور وہ یہ کہ اردو کی طرح سندھی زبان میں بھی اپنے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں موجود ہیں۔ آج تو یورپ کی کئی زبانیں اپنی ہمسایہ زبانوں سے متاثر دکھائی دیتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ صرف وہی زبانیں قبول کرتی ہیں، جن کا اپنا کینوس وسیع ہوتا ہے اور جن میں دوسری زبانوں کے الفاظ پیوست کرنے کی زیادہ قوت ہوتی ہے۔

قرآنی تعلیمات کا فروغ

سندھی زبان و ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی اور سندھی زبان کا مشن ایک ہی ہے، یعنی یہ کہ اسلام کی تبلیغ اور قرآنی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کی جائے۔ عربی کی طرح سندھی زبان میں بھی مترادفات کی کمی نہیں۔ مترادفات کے ساتھ ساتھ ہر جاندار شے کی عمر کے لحاظ سے الفاظ اور نام مخصوص ہیں۔ مثلاً اونٹ اور اسپ کی ہر عمر کے لئے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ یہ دونوں خوبیاں اس امر کی نشان دہی کرتی ہیں کہ سندھی زبان دلکش اور وسیع ہے اور اپنی جامعیت کے سبب زندہ زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس زبان میں جذب و کشش کی ایسی مثالیں ملتی ہیں، جو دوسری زبانوں میں ناپید ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے 'شاہ جو رسالو' میں اس طرح کی کئی مثالیں پیش کی ہیں اور مختلف انداز اپنائے ہیں۔ علامہ آئی آئی قاضی فرماتے ہیں۔

"سندھی زبان، جو زیادہ سے زیادہ ایک صوبائی محاورے کی منزل پر تھی، وہ شاہ صاحب کے ہاتھوں ایک نہایت گراں مایہ اور وسیع ترین زبان بن چکی ہے۔ یہاں تک کہ ہم نہ اسے پہچان سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ وہی سادہ اور پرانی صوبائی زبان ہے لہٰذا کسی ناگزیر معیار کے مطابق جسے یورپ کے بڑے بڑے نقادوں نے آخری معیار تصور کیا ہے، یہی کامیابی کا سہرا حضرت لطیف کے سر ہے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھی زبان کو نہ صرف غیر معمولی زبان بنا دیا، بلکہ اس کے ذریعے اسلام کی تبلیغ اور قرآن تعلیمات کے فروغ و اشاعت کا بھی کام لیا انہوں نے اس زبان کو اپنے افکار جلیلہ کے ذریعے اس منصب اولیٰ تک پہنچا دیا کہ یہ زبان زندہ جاوید ہو گئی۔ مشرق اور مغرب کے مشاہیر شعراء کے مقام سے جو خوبی شاہ عبداللطیف کو آگے لے جاتی ہے، وہ ان کی شعوری اور نظری اہمیت اور انداز بیان کی جدت اور ندرت ہے، جس میں اصلیت اور معنویت کو اولیت اور شاعرانہ فن کی خوبیوں کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے سندھی زبان اور اپنی شاعری کے سہارے قرآنی تعلیمات کے فروغ کے لئے جو خدمات انجام دیں، وہ سنہری حروف میں رقم کرنے کے قابل ہیں۔

آب حیات کا عمیق مہران

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی چونکہ ایک بلند پایہ درویش صوفی بزرگ تھے، اس لئے آپ کے کلام کا بیشتر حصہ پند و نصائح کے نکات پر مشتمل ہے۔ 'شاہ جو رسالو' کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ تمام شاعری علیٰ اسلام کے بنیادی ارکان اور ایمانی عقائد کی تبلیغ پر مشتمل ہے بالفاظ دیگر، اس میں پیغمبری کی ترجمانی ہے۔ اور وہ ترجمانی بھی محض سطحی نہیں، بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے ایمانی جوش اور جذبہ کا نتیجہ ہے، جس میں انسانیت کے مرجھائے ہوئے چمن میں تازگی پیدا کرنے کے لئے آب حیات کا عمیق مہران موجزن نظر آتا ہے۔ مولانا روم علیہ رحمتہ کی مثنوی کی شان میں مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

مثنوی، مولوی، معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

مولانا جامیؒ کے اتباع میں وادی مہران میں حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالہ کے متعلق بھی ایک صدائے بازگشت کانوں میں گونجتی ہے کہ ؎

ہست قرآں در زبان سندی

اس صدا کی گواہی خود شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس شعر میں دی ہے ؎

بیت کے پانئیو ماٹھُا، سي آيتون آهين
نیو من لائین، پريان سندي پارڈي

(ترجمہ) تم جو بیت سمجھتے ہو، وہ آیات ہیں اور یہ آیات بندے اور خدا کے درمیان محبت کا رشتہ ہیں۔

رسالہ کی ترتیب و اشاعت

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی صاحب حال درویش تھے۔ واردات قلب کے دوران آپ مراقبے میں ہوتے۔ اس عالم میں آپ کی زبان سے ابیات کا سلسلہ جاری ہو جاتا اور کافی دیر تک رہتا۔ حاضرین فقراء وہ تمام ابیات حفظ کر لیتے تھے۔ اور بعد میں آپ کو محفل سماع میں سناتے تھے۔ ان ہی ابیات سے شاہ جو رسالو کی تدوین عمل میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عظیم رسالہ خود شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا، مگر یہ رسالہ کسی طرح ضائع ہو گیا۔ ان کی صحبت میں بیٹھنے والے ایسے معتقد اور فقیر بھی موجود تھے، جنھیں یہ تمام رسالہ ازبر ہو چکا تھا۔ ادھر عقیدت مندوں کا اصرار بڑھا کہ رسالہ دوبارہ ترتیب دیا جائے۔ ادھر شاہ صاحب نے اپنے ایک معتقد مائی نعمت کو بلایا، جسے شاہ جو رسالو کا ایک ایک لفظ حفظ تھا۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اگر چاہتے ہو کہ رسالہ ازسر نو محفوظ ہو جائے۔ تو مائی نعمت سے لکھوالو۔ اس پر شاہ جو رسالو کی دوبارہ تدوین و ترتیب عمل میں آئی۔ خود شاہ صاحب نے اس پر نظر ثانی فرمائی اور اسے مستند قرار دیا۔ پھر آپ کے انتقال کے بعد آپ کے بڑے خلیفہ تمر فقیر نے اس رسالہ میں وہ کلام بھی شامل کرایا، جو مائی نعمت کے مرتبہ نسخے کے بعد شاہ صاحب نے فرمایا تھا۔ تمر فقیر نے اس متبرک نسخہ کو

'گنج' کا نام دیا۔

'گنج' کی تدوین و ترتیب دوسرے اہل قلم حضرات اور عقیدت مندوں کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنی اور انہوں نے بھی شاہ عبداللطیف کے ابیات کو جمع کرنا شروع کیا اس طرح شاہ صاحب کے رسالہ کے چند متفرق نسخے وجود میں آگئے جن میں نعمت والا نسخہ، تمر فقیر والا نسخہ اور بھیڑی والا نسخہ بہت مشہور ہوئے۔ آج بھی ان نسخوں کی نقول چند خاندانی کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ان قلمی نسخوں کی تعداد ستائیس ہے۔

'شاہ جو رسالو' کی طباعت کا آغاز پہلے ایک جرمن مستشرق ڈاکٹر ارنیسٹ ٹرمپ نے کیا۔ رسالے کا یہ ایڈیشن ۱۸۶۶ء میں جرمنی کے شہر لیپزگ میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مختلف ایڈیشن بمبئی اور کراچی کے کتب خانوں نے شائع کیے۔ اب تک رسالے کے شائع شدہ مشہور ایڈیشنوں میں ڈاکٹر ٹرمپ کا ایڈیشن، سرکاری ایڈیشن مطبوعہ حکومت سندھ، ایڈیشن مرتبہ مرزا قلیچ بیگ، 'ڈاکٹر گوربخشانی ایڈیشن' شاہوانی ایڈیشن مرتبہ غلام محمد شاہوانی مرحوم' سندھی ادبی سوسائٹی ایڈیشن، مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کا مرتبہ ایڈیشن، مولانا محمد عثمان ڈیپلائی، علامہ آئی آئی قاضی اور کلیان اڈوانی کے ایڈیشنوں کے علاوہ برٹش میوزیم کا ایڈیشن قابل ذکر ہیں۔

جدید تحقیق کے مطابق شاہ جو رسالو کے کئی اور قلمی نسخے بھی سندھ کے متعدد گھرانوں میں موجود ہیں۔ اس امر کا انکشاف چند برس قبل ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ "۱۸۶۷ء میں شاہ صاحب کے کلام کی وہ اشاعت 'جسے بمبئی والی اشاعت کہتے ہیں' بہت مقبول ہوئی اور اس کے ذریعے شاہ صاحب کا رسالہ عام ہو گیا لیکن رسالہ کے قلمی نسخے سندھ کے گوشے گوشے میں موجود تھے۔ گذشتہ صدی کے اواخر میں میر عبدالحسین خان سانگی جیسے ادیب و شاعر اور عاشق لطیف پیدا ہوئے جنھوں نے شاہ صاحب کے حالات زندگی کے متعلق معلومات اور ان کے رسالے کے قلمی نسخوں کو رقم کرانے اور ان کی تشہیر کے سلسلہ میں خوب خوب جدوجہد کی۔ ان کی تالیف 'لطائف لطیفی' شاہ صاحب کی سوانح سے متعلق پہلی کتاب ہے' جس کو ان کے بعد آنے والے علماء ماخذ کے طور پر استعمال کرتے رہے ہیں۔ میر صاحب مرحوم نے شاہ جو رسالو' کے کئی نسخے رقم کر دیئے' جو ان کے بعد آنے والے علماء کے لیے مفید ثابت ہوئے۔ آنجہانی ڈاکٹر گوربخشانی نے رسالہ شاہ شائع کروایا تھا۔ اس کی جلد دوم اور سوم کی تیاری میں بھی میر صاحب کا قلمی نسخہ ایک اہم ماخذ بن گیا۔"

ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی رحلت سے کچھ عرصہ قبل اپنے فقیروں سے شاہ جو رسالو کے تمام نسخے منگوا کر بھٹ شاہ کے قریب بہنے والی 'کرار' جھیل میں پھنکوا دیے تھے۔ اس خیال سے کہ مبادا ان کے بعد لوگ انہیں سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں مورخین و محققین کی اکثریت اس روایت کو درست تسلیم نہیں کرتی اور اسے بالکل بے بنیاد گردانتی ہے، کیونکہ شاہ صاحب کے کلام میں ایسی کوئی بات نہیں ہے' جو گمراہ کن اور خلاف شریعت ہو۔

شاہ صاحب کا اندازِ تصنیف

'شاہ جو رسالو، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی جدت پسند طبیعت کا مظہر ہے۔ اس کا اندازِ تصنیف منفرد اور اچھوتا ہے۔ وہ موسیقی کو شاعری سے علیحدہ نہیں سمجھتے' بلکہ بسا اوقات تو فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری، موسیقی کی منت کش احسان ہے یا موسیقی شاعری بن گئی ہے۔ 'شاہ جو رسالو' کے اندازِ تصنیف سے معلوم ہوتا ہے تو شاہ عبداللطیف کے ہاں شاعری اور موسیقی لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بہ آسانی عامۃ الناس کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ 'شاہ جو رسالو' کی تمام نظمیں' چونکہ سازی مختلف دھنوں پر گانے کیلیے لکھی گئی تھیں۔ اس لیے تمام کی تمام غنائیہ شاعری کے زمرے میں آتی ہیں۔

یہ امر افسوس ناک ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا سارا الکلام حقیقی شکل میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں جن لوگوں نے ان کے کلام کو یکجا کیا۔ انہوں نے اس بات کی زیادہ پروا نہیں کی کہ شاہ کے کلام میں رطب ویابس شامل نہ ہونے پائے۔ ان لوگوں نے جوشِ عقیدت میں شاہ عبداللطیف کی شاعری میں ایسے زوائد شامل کر دیے۔ مثلاً شاہ لطیف کہتے ہیں اور اس طرح شاہ کی اصل شاعری میں شاہ کے نام سے تبصرے نظم کر دیے گئے۔ یہ زوائد عام طور پر عنایت' لکھومیر' اور جیئجو کے کہے ہوئے ہیں اور شاہ عبداللطیف کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ یوں شاہ جو رسالو، کے بعض اشعار ایسے بھی لوگوں تک پہنچے ہیں، جو دوسروں کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ البتہ بعد میں 'شاہ جو رسالو' کے جو چند ایک نسخے شائع ہوئے وہ کافی حد تک زوائد سے مبرا ہیں۔

مختلف زبانوں کی غنائی شاعری رومان کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھتی' لیکن شاہ جو رسالو اولین مثال ہے کہ شاعری کی غنائیت کے باوجود اسرار و رموز اور تصوف کے نکات دلآویز شاعری بن گئے ہیں۔ 'شاہ جو رسالو' مزاج معانی اور زبان کے اعتبار سے پر اثر شاعری کا مجموعہ ہے اصل شاہ جو سالو' زیرِ نظر ہو، تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاہ عبداللطیف کی شاعری میں آمیزش ممکن نہیں اب تو شاہ صاحب کے مداح ایسے اشعار فوراً پہچان لیتے ہیں، جو شاہ صاحب کے نہیں ہیں، گویا اطلس و کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہو، تو فوراً پہچانا جاتا ہے بس یہی صورت حال شاہ جو رسالو میں زوائد کو پڑھ سن کر پیدا ہوتی ہے۔

شاہ عبداللطیف کی شاعری کی بنیاد روحانی عشقیہ تصوف پر ہے۔ ان کے تصوف کو فلسفہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کے عاشقانہ کلام میں گو تمام علامات' دنیاوی عشق کی ہیں، تاہم انھوں نے کہیں بھی محبوب سے شکوہ و شکایت نہیں کی۔ ان کے لب و لہجہ میں کرختگی، سختی، سنگ دلی یا طعن آمیزی نہیں ہے، بلکہ کبھی بھی وہ عاشق و معشوق کی جدائی یا وصل کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے ایک ایک لفظ سے محبت کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ جو رسالو' ایسے ہی روحانی عشقیہ تصوف سے عبارت ابیات کا مجموعہ ہے۔

'شاہ جو رسالو'۔ تین حصوں میں منقسم ہے۔ اول صوفیانہ شاعری، جس میں عشق مجازی عشق حقیقی سے ہم آہنگ ہوتا نظر آتا ہے 'شاہ جو رسالو' کا یہ حصہ عاشقانہ بھی ہے اور دعائیہ بھی دوم فطری اور سماجی شاعری' جس میں سندھ کی سماجی زندگی' موسم' قدرتی مناظر' فقیروں اور اولیائے کرام کی عادات و صفات اور واقعہ کربلا کی روشنی میں حضرت امام حسن رضؓ اور حضرت امام حسین رضؓ کے مصائب نظم کیے گئے ہیں اور سوم لوک کہانیاں' جس میں ان مروجہ لوک کہانیوں کے چیدہ چیدہ اقتباسات نظم کیے گئے ہیں۔ جن کو سندھی مائیں اپنے بچوں کو پالنا جھولاتے وقت سنایا کرتی تھیں۔ شاہ جو رسالو کا یہ حصہ بے حد مقبول ہوا ہے۔ بظاہر شاہ جو رسالو' کے یہ تین حصے ہیں، لیکن ان کے ہر حصے کی شاعری میں تصوف، شعریت اور موسیقیت نمایاں ہے۔ ان کا ہر شعر تصوف کے رنگ میں ڈوب کر باہر نکلتا ہے لیکن جب الفاظ کا جامہ پہنتا ہے تو شعریت لے اپنے قالب میں ڈھال لیتی ہے۔

'شاہ جو رسالو' کے مطالعہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے شاعری کے میدان میں عربی اور فارسی کے زوال پذیر اثرات کو ایسے زمانے میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب کہ سندھ ابھی کامل طور پر عہد متوسط کے دور سے نکل نہیں سکا تھا۔ 'شاہ جو رسالو' کا، نیا ایک انداز ہے جس کو اپنانا دوسروں کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ 'شاہ جو رسالو' میں

شاہ عبداللطیف مولٰینا رومیؒ سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن انہوں نے کہیں بھی رومیؒ 'حافظؒ' یا بسطامیؒ کا تتبع نہیں کیا۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے، جنھوں نے پہلی بار انتہائی چابک دستی سے عوام کی زبان استعمال کی اور اس کے توسّل سے حسن اور مذہبی فلسفہ کی ترجمانی کا حق ادا کیا انہوں نے فارسی شاعری سے فائدہ ضرور اٹھایا لیکن مقامی رنگ اور زبان کی خوبیوں کو برقرار رکھا۔

۳۶ - ابواب کے مندرجات

'شاہ جو رسالو' کے تقریباً ۳۶ ابواب ہیں، جن کو سُر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چند معروف ابواب میں سُر کلیان' سُر یمن کلیان' سُر سوہنی' سُر سسی' سُر سورٹھ' سُر کھمبات' سُر رانو' سُر سامونڈی، سُر سری راگ، اور سُر کاموڈ قابل ذکر ہیں۔ ہر باب مقصدیت اور افادیت سے بھر پور خیالات کا آئینہ دار ہے۔ ہر مکتب فکر کے لوگوں کے لیے ان میں انبساط آفریں اور حیات افروز پیغام موجود ہے جس سے ان کے بلند کردار اور بے لوث شاعر اور مفکر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ نئی نسل کو 'شاہ جو رسالو' کے مطالعہ سے ایک معتبر لائحہ عمل کی ضمانت ملتی ہے اور سندھ کا بچہ بچہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کو سندھی زبان کا محسن اعظم اور سندھی شاعروں کا سرتاج تسلیم کر لیتا ہے۔

'شاہ جو رسالو' میں تقریباً پانچ ہزار ابیات اور "وائیاں" ہیں، جو کہ مضمون اور راگنی کے لحاظ سے مختلف سروں یعنی عنوانات کے مطابق تقسیم کئے ہوئے ہیں۔ ہر سر کم از کم دو یا اس سے زیادہ داستانوں میں منقسم ہے اور ہر داستان میں دس سے بارہ ابیات اور ایک یا دو "وائیاں" شامل ہیں۔ رسالے کے چند نسخوں میں سروں کی ترتیب اور تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے' لیکن عام طور پر رسالے میں بتیس سر تصور کیے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالہ میں جن مضامین کے متعلق کلام ہے۔ ان کے چند عنوانات یہ ہیں، حمد و ثنائے رب جلیل، حضور رسالت مآب سے والہانہ محبت کا اظہار، نعت گوئی، عشق الٰہی اور توحید کی تبلیغ، شرک سے گریز، خدا کے برگزیدہ بندوں کی تعریف، اسلامی ارکان کی بجاآوری کی تلقین، عبادت اور ریاضت میں دکھاوے سے گریز کرنا، توبہ کرنے سے نفس کو آلودگی سے پاک وصاف کرنے کی ہدایت، جھوٹ اور فریب کینہ اور کلفت، بغض اور حسد، طمع اور حرص، ظلم واستبداد، فخر و تکبر کو چھوڑنا، مروت اور مساوات، عدل واحسان، حلم وحیا، صداقت و دیانت، محبت و غمگساری، صبر و شکر، نیک نیتی اور خدا ترسی، سخاوت وشجاعت، ایثار و قربانی، جرأت وجاں نثاری کی صفات اختیار کرنا۔ یہی وہ انمول موتی ہیں، جن کی مالا عرف عام میں 'شاہ جو رسالو' کے نام سے مشہور ہے۔ رسالہ کیا ہے؟ خزینہ معرفت ہے۔ عبدالواحد سندھی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"بھٹائیؒ کا دیوان 'شاہ جو رسالو' سندھ کے گوشے گوشے میں عقیدت سے پڑھا جاتا ہے اس رسالے نے سندھی زبان پر فیصلہ کن اثر ڈالا ہے اور سندھی زبان کو ورطۂ معانی سے مالا مال کر دیا ہے۔ آج اس رسالے کے سیکڑوں اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ بے شمار مصرعوں نے ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ہزاروں ترکیبیں روزمرہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔"

پیغام توحید

یہ بھی 'وہ' ہے 'وہ بھی 'وہ' ہے
حیات بھی وہ ہے موت بھی وہ ہے
وہی مددگار بھی' وہی دشمن بھی
اور جان بھی اور دوست بھی وہ ہے

عظیم توحید پرست صوفیائے کرام کا ایمان وحدت الوجود پر رہا ہے اور ایسے بزرگ صوفی ہمیشہ توحید وحدت الٰہی اور یحق کے ساتھ ساتھ ذکر نبیؐ کو بھی اپنے درس میں شامل کرتے رہے ہیں۔ مذکورہ بیت میں ہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اپنے اسی ایمان اور عقیدے کا اظہار کیا ہے۔ وہ بلاشبہ ایک ایسے شاعر ہیں کہ جن کے کلام میں جگہ جگہ محبوب حقیقی کی اطاعت کا جذبہ اور تلقین ملتی ہے۔ انہوں نے خود بھی باری تعالٰی کی عظیم اور مقدس ترین ذات سے اپنا عشق قائم و دائم رکھا اور سچے خدا پرست صوفی کہلائے۔ ان کی منزل خدا سے قربت کی منزل تھی اور اس منزل تک رسائی کے لیے وہ رسول خدا کی ذات والا صفات کو ذریعہ بنانے کے حق میں تھے شاہ حسین کے نزدیک شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ خدا سے رشتے اور رسول کی الفت کی باتیں ہی کرتے ہیں کہ ان کا عقیدہ وحدت الوجود مسئلہ توحید کی روشنی میں ہے۔ خود شاہ صاحب نے اس عقیدہ کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے

" محل ایک ہے، جس کے لاکھوں دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں'
جدھر دیکھتا ہوں اور جہاں دیکھتا ہوں۔ وہاں محبوب سامنے کھڑا نظر آتا ہے"

خدا کی رضا حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک اسلامی لائحہ عمل' جس کے تحت کلام مجید انتہائی خلوص اور فہم کے ساتھ تلاوت اور قرآنی احکامات کی تعمیل شامل ہے، جبکہ دوسرا ذریعہ حضور اکرمؐ کی حرمت و اطاعت کا ہے۔ یہ دونوں ذریعے خدا تک پہنچنے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے مشن کا حاصل یہی ہے اور اسے ہی 'وحدت الوجود' کا نام دیا گیا ہے۔ مخدوم امیر احمد اس بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب نے سب سے اول قرآن پاک کی بنیادی تعلیم توحید کو لیا، کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ اس عالم اضطراب و بے چینی کا علاج سوائے اس کے ممکن نہیں کہ عوام میں توحید کے عقیدے کو مستحکم کیا جائے تاکہ وہ ہر حال میں خدائے ذوالجلال پر بھروسہ رکھیں۔

اقبال اور شاہ عبداللطیف

حکیم الامت علامہ اقبال کو حافظ شیرازی کے جام میں "زہر ہلاہل" نظر آیا اور اسی خیال سے انہوں نے آواز دی کہ "ہوشیار از حافظ صہبا گسار"۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نظر شاید اس وقت اس وضاحت پر نہ پڑی ہو' جو "تنگنائے غزل" کے متعلق غالب نے کی ہے یعنی"

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور پھر خود اقبال نے مرشد رومی کی مریدی سے یہ واضح کر دیا کہ وہ تصوف کے قائل ہیں مگر ایسا تصوف جو "خودی" اور "بے خودی" کے ان رموز سے متصادم ہوتا ہو ان کو پسند نہیں اس لیے کہ وہ تصوف قوم کے قوائے فکر و عمل کو مضمحل کر دیتا ہے۔ ضیاء حسن موسوی کے بقول "اسی پس منظر میں جبکہ ایران اور برصغیر پاک و ہند میں تک حافظ شعر و ادب پر چھایا ہوا تھا مغل سلطنت کا سورج دکن کے نصف النہار سے ٹکرا کر مائل بہ زوال ہو چکا تھا۔ اور بقول قائم ریختہ ابھی غزل طور "نہیں ہوئی تھی اور میر و غالب ابھی کتم عدم میں تھے۔ اس وقت جب سندھ کی سرزمین سے لال لطیف کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس میں کچھ زندگی آموز اور حیات آمیز سر ملتے ہیں تو تاریخ ادب کا طالب علم ٹھہر کر اس آواز کو سننے پر مجبور ہو جاتا ہے"۔

اس میں کلام نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا تصوف زندگی آموز ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی آمیز بھی ہے۔ وہ خود بھی محبوب حقیقی کے عاشق صادق ہیں اور اس امر کے بھی خواہاں ہیں کہ عوام الناس ان کے محبوب کو اچھے طریقے سے بخوبی پہچان جائیں، اور گمراہ اور بے راہ رو نہ ہوں۔ ان کے خیال میں ہموار اور کشادہ راہ پر سفر کرنے کے لیے حقیقی جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور یہ جذبہ قرآنی تعلیمات سے ہی ابھر سکتا ہے۔ ان کے نظریہ وحدت الوجود کی کئی مثالیں ان کے کلام میں بھی مل جاتی ہیں۔

وہ اللہ کی حمد کے ترانے گاتے ہیں۔ اس کی نعمتوں کا بار بار شکریہ ادا کرتے ہیں، اس کی عظمت وجلالت اور اپنی بندگی اور عاجزی کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں ان کے نظریہ تصوف سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا خدا سب کا خدا ہے، جو اپنی جلالت وغضب کے باوجود ہر گھڑی رحم اور عفو پہ مائل رہتا ہے۔ تدبیر اور تقدیر اور دکھ سکھ کا مالک وہی ہے۔ ان کے خدا سے ہمیں خوف نہیں آتا، بلکہ اس سے محبت کرنے اور اس کی آرزو کرنے کی تمنا جاگتی ہے۔ دل لذتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ سر عاجزی سے جھکنا چاہتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی عمر بھر علائق دنیا سے دور رہے۔ اپنے کلام میں کہیں کہیں اگر انہوں نے لذات دنیا سے رغبت ظاہر بھی کی ہے تو محض استعارہ کے طور پہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کے لیے لکھتے تھے۔ وہ حسن فطرت کے بڑے گرویدہ تھے۔ جہاں کہیں انہوں نے اس حسن کے جادو کا ذکر کیا ہے، ایسی محبت اور عقیدت سے کیا ہے کہ اس کے ڈانڈے حسن فطرت سے مل گئے ہیں۔

تصوف کے اسرار و رموز

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا نظریہ تصوف حمد وثنائے رب جلیل اور ذکر سرکار دوعالمؐ کے ارد گرد ہی گھومتا نظر آئے گا۔ محبوب حقیقی کی توصیف میں بھی وہ اس نظریے کو نہیں چھوڑتے اور کہتے ہیں کہ

"میرے محبوب کی پیشانی سے نور برس رہا ہے۔ چاند اور سورج میرے محبوب کا مقابلہ نہیں کر سکتے، کیونکہ ان میں حسن تو ہے نیکی نہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ شاہ عبداللطیف عظیم صوفی شاعر تھے اور وحدت الوجود پر ان کا ایمان تھا، مگر وہ تصوف کے تمام اسرار و رموز سے بھی آگاہ وحق بین تھے۔ وہ گوشہ گیر ہو کر صرف عبادت ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ پیام الٰہی کو عام کرنے کے لیے ہر اس ذریعہ کو آزماتے تھے، جو ان کے قبضۂ قدرت میں تھا۔ ان کے کلام کا کوئی قصہ ایسا نہیں ہے، جسے شہرت عام اور بقائے دوام نصیب نہ ہوئی ہو۔ قرآن پاک کی تعلیمات، اسرار الٰہی کے ارشادات اور روحانیت کے بکثرت مسائل، ان کے کلام کی بدولت عوام تک پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے گویا ایسے تصوف کی بنیاد ڈالی ہے کہ جو ہر مکتب فکر اور ہر قسم کے افراد کے لیے مناسب ہو۔ شریعت، طریقت، معرفت، ادبیت، غنائیت اور الفاظ ومعانی کی موزونیت وغیرہ تمام محاسن ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں اور وہ شاہ عبداللطیف کو حیات جاوداں بخشنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کی آواز میں کس قدر اعتماد واحساس تھا آیئے ذرا ان کا یہ نغمہ سنیں کہ یہ صوفی مشرب شاعر، رنگ تصوف میں اپنے محبوب کے متعلق کس قسم کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

"میرا محبوب خیر مجسم ہے، مگر جسے اس کا احساس نہ ہو۔ اس لیے کہ جب وہ میرے پاس آیا، تو اس نے میرے عیوب اور کوتاہیوں پر مجھے شرمندہ نہیں کیا۔

جب میرا محبوب خراماں ہوتا ہے تو زمین بسم اللہ کی صدا دیتی ہے۔ جہاں اس کے قدم جاتے ہیں۔ وہ ان قدموں کو ادب سے بوسے دیتی ہے۔ حوریں احتراماً دم بخود کھڑی ہو جاتی ہیں۔ میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میرا محبوب سب سے زیادہ حسین ہے۔

جنگلوں اور صحراؤں میں تو کیوں جاتا ہے؟ اسے لطیف تیرا محبوب کسی دوسری جگہ پوشیدہ نہیں۔ ذرا نظریں تو جھکا، وہ تیرے ہی اندر بسا ہوا ہے۔

اس جیسے بہت سے سورج نکل آئیں، تب بھی میرے محبوب کے بغیر دنیا میرے لیے اندھیر رہے گی۔ جا اے سورج تو ڈوب جا۔ میں تیری روشنی میں اپنے محبوب سے نہیں ملنا چاہتا۔

محبوب کے حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے مر کر زندہ رہو۔ اگر تم نے ایسا کر لیا، تو عظمت حاصل کر وگے۔

محبوب کے پہلو میں زندگی بسر کرنے کے لیے اپنی جان دے دو۔ جان دے کر ہی دوست ملتا ہے۔

خدا جس سے محبت کرتا ہے، اس کی جان کا نذرانہ قبول کرتا ہے۔ یہی مرغوب سنت الٰہی ہے، جو اللہ سے لو لگاتے ہیں، ان کا دل خوف سے کبھی نہیں دھڑکتا۔

میرا محبوب میرے درد کا درماں ہوگا۔ جب وہ آئے گا تو میرے حال زار پہ رحم کرے گا!

اللہ میرا درد میرے چارہ ساز محبوب نے دور کر دیا۔ سچ ہے میرا حبیب بڑا صادق ہے۔"

وحدت الوجود اور تصوف

شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تصوف، لامحدود خوبیوں کا حامل ہے۔ وہ انسان کو دنیا میں رہ کر دنیا کے ساتھ چلنے، دین کی خدمت، والدین کی خدمت اور خدا کی اطاعت اور قرآن کے احکامات کی تعمیل کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے نظریہ تصوف کا شہرہ وادی مہران یا پاکستان تک محدود نہیں ہے، بلکہ غیر ملکی صاحب نظر بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جرمنی کی عالم فاضل خاتون کا کہنا ہے کہ شاہ عبداللطیف وحدت الوجود کے قائل ہیں اور ان کے ہر قصے کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے۔ ان کی شاعری کے تمام کردار اس بات پر متفق ہیں کہ روز ازل سے جب ابھی کسی فرشتے اور انسان کا وجود عمل میں نہ آیا تھا، محبوب حقیقی کی جستجو مقرر ہو چکی تھی۔ فرشتے اور انسان اسی جاودانی عشق کی ناقابل فراموش خطا پر ہیں۔ ڈاکٹر اینی میری شمل کے ان الفاظ کی صداقت سے انحراف ممکن نہیں۔ رحیم داد خان مولائی نے بھی اس نظریے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ دین متین کے ساتھ کاروبار کرو۔ بازار میں خرید وفروخت کرنا، خود اور اپنے اہل وعیال کی پرورش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانا۔ یہ سارے کام عبادت میں شامل ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ سائیں، جس عبادت کے لیے جوانوں کو دعوت دیتے ہیں، اس کا دائرہ فقط تسبیح، مصلے، مساجد اور خانقاہوں تک محدود نہیں، بلکہ دین کے بہادروں کو دنیا کا کام بھی کرنا چاہیئے، کیونکہ انسانوں کو کائنات میں اشرف المخلوقات کا شرف حاصل ہے۔ وہ شرف صحیح معنوں میں اس وقت ہی حاصل ہو سکتا ہے، جب دین کے دائرے میں رہ کر دنیاوی کاروبار بھی کیے جائیں۔ شاہ عبداللطیف کے نظریہ وحدت الوجود اور تصوف اسی بات کا پابند کرتے ہیں کہ دین کی خاطر دنیا کو اور دنیا کی خاطر دین کو تج نہ دیا جائے۔ بیشتر صوفیائے کرام نے ترک دنیا کو شعار بنایا اور اسی کی تعلیم بھی دی۔ لیکن شاہ عبداللطیف نے ترک دنیا کی تلقین کبھی نہ کی اور نہ ہی اپنے تصوف کے فلسفے کو ایک خاص قسم کی چار دیواری میں مقید کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ شاہ عبداللطیف قرآن، مثنوی مولانا روم اور ملا معین کی تعلیمات سے فیض یاب تھے۔ ضیا الحسن موسوی کی رائے میں وہ نہج البلاغۃ اور صحیفہ کاملہ کی حیات وکائنات آموز تعلیمات سے بھی بہرہ مند تھے۔ ان کا تصوف امام الاولیاء اور ائمہ معصومین کے اقوال واذکار سے بھی سرشار تھا، اور وہ بڑے حق آگاہ صوفی تھے۔ ان کو سینہ بہ سینہ

جو روایاتِ تصوف پہنچی تھیں وہ عجمی اور ہندی تصوف تک محدود نہ تھیں، بلکہ ان کا تصوف اویس قرنی، سلمان فارسی، ابوذر غفاری اور عمار یاسر کی معرفت کے سرچشموں سے سیراب تھا۔ اس میں اس ہاشمی معرفت کی جھلک تھی جس میں رنگ و آہنگ ایک پردہ تھا اور اس پردہ میں سوز و ساز اور نور و سرور پنہاں تھا۔ انہوں نے غم دوراں کے گیت گائے تھے۔ مگر ماحول کے پیش نظر اس کو غم جاناں کا رنگ دیا تھا۔ انہوں نے عرفانی مطالب کے لیے "مزامیر آل داؤد" سُر پائے تو "سُر حسینی" ایجاد کر لیا اور سندھ کی عشقیہ داستانوں کا سہارا لے کر انسانی دکھ درد بیان کر گیے اور طائیت و ملوکیت زدہ عوام کو زندگی کے عجب نغمے سنا گئے۔ کبھی انہوں نے "نگرمچھ" سے مخاطب ہو کے کہا :۔

"تم اپنے سے کمزوروں کو کھا کے موٹے ہوئے ہو اور غرور و تکبر سے دوسروں کو ستا رہے ہو، مگر جس سیلاب پر تم کو بھروسہ ہے، وہ ختم ہو رہا ہے اور تمہارا حشر برا ہونے والا ہے"۔

اور کبھی کسی خاص پرندے کی قسم کے میل ملاپ کی مثال دے کر کہا کہ :۔

"وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ بلکہ قطاریں بنا کے چلتے ہیں"۔

اور کبھی دار کی دعوت دیتے ہوئے کہا :۔

"اگر میرے ساتھ کسی کو چلنا ہے، تو چلے، دار پر جانا ان ہی کا کام ہے، جو محبت کا نام لیتے ہیں۔ دار تو درحقیقت عاشق کے گلے کا ہار ہے۔ اس سے ہچکیانا ایک عتاب کا شکار ہونا ہے"۔

پھر کبھی وطن کے گیت گاتے ہوئے کہا کہ :۔

"میری آرزو ہے کہ اس وطن کا نظارہ کرتے کرتے جان دے دوں"

کبھی عملی زندگی کی سادہ سی تعبیر یوں بیان کی کہ :۔

"تمہیں سوت کاتنے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ تمہیں تو بس سونے اور اپنی ہڈیوں کو آرام پہنچانے کی فکر ہے۔ اچانک جب عید کی صبح آئے گی، لوگ نئے کپڑے سے محروم رہیں گے اور خود تمہارے پاس بھی اچھے کپڑے نہ ہوں گے اور تمہاری سہیلیاں تم کو سنوارنے کے لئے آئیں گی تو کیا ہو گا"۔

زندگی کی اس سادہ تعبیر میں شاہ عبداللطیف نے حیات و ممات کے فلسفے کو بھی بیان کر دیا ہے۔ سوت سے ان کی مراد اعمال صالح سے ہے، اور عید سے مراد ان کی محبوب حقیقی سے ملنے کی خوشی سے ہے۔ اس خوشی کی خاطر وہ مشکلات جھیلنے پر بھی آمادہ نظر آتے ہیں :۔

"اگرچہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مجھے اونچے چٹیل پہاڑوں اور میدانوں سے گزرنا ہو گا۔ تنگ راستے پیش آئیں گے لیکن میں اپنے محبوب کے غم کو سینے سے لگائے جو ہمیشہ میرے ہمراہ رہے گا تمام مشکلات سے بآسانی گزر جاؤں گا"۔

شاہ عبداللطیف نے کیہر قوم کے ظالم حکمران کا اونٹوں تک پر ظلم کرنا سن کر کہا :۔

"غارت ہو جائیں یہ محلات اور شتربانوں کے خیمے ہمیشہ آباد رہیں۔ میں اونٹنیوں کے دودھ کی لذت کیسے بھول جاؤں۔ شتربانوں کو خدا خوش رکھے اور ان کو ستانے والے دودھ سے محروم رہیں۔ سن لو بیٹو۔ سن لو۔ جہاں آج کیہر قوم کے محلات ہیں کل یہاں شتر خانے بنیں گے"۔

اور کبھی سطوت و وسعت فکر و خیال کا نمونہ یوں پیش کیا :۔

"بجلیاں تیزی سے بلندیوں پر دوڑیں اور استنبول پر جا چمکیں، انہوں نے مغرب کا رخ کیا۔ وہ "خطا" پر چمکیں، انہوں نے سمرقند کو اپنی بھرپور بارش سے نورانی بنایا۔ یہ بجلیاں روم اور کابل گئیں اور قندھار تک جا پہنچیں۔ دہلی پر ایک کڑکتا بادل گرجا اور دکن کے وسیع میدان پر چھا گیا"۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے وحدت الوجود اور تصوف میں ان تمام موضوعات کو سمو دیا ہے۔ تصوف کی دنیا میں ان کی نئی آواز سنائی دیتی ہے۔ آج ان کی آواز سن کر ہر حساس دل دھڑکنے لگتا ہے۔

تصوف اور انقلاب

ایک زمانے تک تنقید نگاروں کا یہ نظریہ رہا ہے اور شاید آج بھی ادبی نقادوں کا ایک گروہ اس خیال کا حامی و موید ہے کہ صوفیانہ شاعری قوم کی مریضانہ ذہنیت کی علامت ہے کیونکہ تصوف کے ذریعے لوگوں کو قناعت کرنا، ترک دنیا، رہبانیت اور فنا کی تعلیم دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان تعلیمات کا نتیجہ زوال و انحطاط کی شکل میں رونما ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصوف یا صوفیانہ شاعری کے بارے میں اس قسم کی رائے قائم کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ جب کسی معاشرے کی بنیادیں عوام کے مادی اور روحانی استحصال پر قائم ہو جاتی ہیں۔ طبقاتی کشمکش شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے، جاگیردار اور سرمایہ دار لاکھوں محنت کشوں کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں تو زندگی کا نقطہ نظر یکسر مادی ہو جاتا ہے اور شرافت، ایثار اور خلوص بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تب تصوف کی روح شعر کے روپ میں انسان کو ایک نئے انقلاب کا پیغام دیتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی ایسے ہی شاعر تھے، جنہوں نے تصوف کی روح سے انقلاب کا کام لیا اور اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو خبردار کیا کہ حقیقی زندگی ادنیٰ مادی خواہشات کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے حصول سے عبارت ہے۔ وہ اپنی صوفیانہ شاعری سے رنگ و نسل، رشتہ و پیوند اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف مستقل جہاد کرتے ہیں، ہر چھوٹے بڑے، شاہ و گدا کو اخوت اور یکجہتی کا پیغام دیتے ہیں اور انسانیت کو مساوات کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ وہ دنیا والوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ مال و دولت جمع کرنے کے پیچھے نہ پڑیں، کیونکہ مادی آسائشیں دیرپا ثابت نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان سے سکون قلب میسر ہوتا ہے۔ المختصر، شاہ عبداللطیف بھٹائی کا نظریہ تصوف ہر انسان کو روحانی ترقی، فکر اور عملی مساوات، عرفان حق، ابطال باطل، ایثار نفس اور عشق حقیقی کی تعلیم دیتا ہے۔

رنگ و آہنگ

گماں کرنا، نہ ان ابیات پہ آثار ظاہر کا
مرے ابیات معنی خیز ہیں آیات قرآنی
کہ آخر فاش ہو جاتے ہیں ان سے ذہن انساں پر
رموز عشق و راز فطرت و اسرار عرفانی!

رسالہ شاہ جو کی ساری شاعری سروں کی صورت میں ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس انداز میں شاعری کی کہ وہ موسیقی کا ایک جزو لاینفک بن کر رہ گئی۔ آج ان کی شاعری اور موسیقی ایک دوسرے میں اس طرح جذب ہیں کہ ہر داستان کے ساتھ ایک سُر مخصوص ہے اور تمام شاعری میں مختلف سروں کے عنوانات بھی ملتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے شاعری کو سُر کے نام سے کیوں موسوم کیا؟ اس کی اغلباً وجہ یہی ہے کہ عظیم شاعری موسیقی کی دھنوں پر کی گئی ہے۔ اور فارسی کی مروجہ بحروں سے اس شاعری کے اوزان بالکل مختلف ہیں۔ چنانچہ جس شاعری کی ترتیب و تہذیب دھن

اور سُرے پر ہوئی ہو، اس کو سُر کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔

نغمہ و شعر - ان ہی سُروں کا نام ہے۔ رسالہ شاہ جو کے چھ سات نسخے مختلف مرتبین نے ترتیب دئے ہیں، ان میں سُروں کی تعداد میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے بعض نے تیس اور بعض نے اکتیس سُریں تحریر کی ہیں۔ جب کہ مرتبین اور محققین کی اکثریت انتیس سُروں پہ اکتفا کرتی ہے۔ ڈاکٹر گربخشانی نے فہرست میں ۳۱ سُر لکھے ہیں لیکن ان میں صرف تیس سُر شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ سُر کلیان اڈوانی کا ذکر مفقود ہے۔ شاہوانی کے مرتب کردہ رسالہ میں سُروں کی تعداد تیس لکھی گئی ہے اور اس میں "سُر کیڈارو" بھی شامل ہے۔ علامہ آئی آئی قاضی اور دیگر مرتبین نے انتیس سُروں کی تفصیل بیان کی ہے اور ان کے نزدیک سُر کیڈارو کی حیثیت مسلمہ نہیں۔ بہر حال شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سُروں کی تفصیل درج ذیل ہے۔

سُر کلیان

یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رسالہ شاہ جو کا پہلا سُر ہے۔ کلیان کے معنی سلامتی کے ہیں۔ اس طرح اس سُر میں شاہ صاحب نے اسلام کا پیغام دیا ہے۔ جو معبودِ حقیقی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ معبودِ حقیقی جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا پیامبر بنا کر اس دنیا میں بھیجا۔ اس سُر میں خدا کی حمد و ثنائے جلیل جس انداز میں کی گئی ہے اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:-

بس وہی اللہ ہے قائم، قدیم
مالک الملک، اول و اعلیٰ علیم
والی و رزاق، احد رب الرحیم
اس کو سچا جان، کر حمد حکیم
صانعِ مطلق ہے وہ قادر کریم
اس کی صنعت سے ہے عالم مستقیم

اس روایت کو اب کوئی مصنف یا شاعر جھٹلا نہیں سکتا کہ دینی اور اخلاقی کتابوں کا آغاز حمد و ثنائے جلیل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اس روایت کا پاس کرتے ہوئے سب سے پہلے سُر کلیان کہا۔ اس سُر میں انہوں نے توحید کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث فرمائی اور اس کے اسرار و رموز بیان کیے۔

سُر کلیان کی لَے، ایسی ہے کہ اسے سن کر انسان یادِ الٰہی میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسے سکونِ قلب میسر آتا ہے۔ متزلزل عقیدہ رکھنے والے انسانوں کو اس سُر میں خدائے لم یزل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور وہ دنیا میں ٹھوکریں کھانے سے بچ جاتے ہیں۔ اس سُر میں شاہ عبداللطیف نے بیان کیا ہے کہ انسان کو صرف اپنے خالقِ حقیقی سے رجوع کرنا چاہیے۔ اور وہی مسبب الاسباب ہے۔ اسی سُر میں ذیل میں وہ فرماتے ہیں

صنعتِ عالم ہوئی جب استوار
دے دیا احمدؐ کو کلی اختیار
جب "آنا مولاک" حق نے کہہ دیا
ساتھ اس کے "انت محبوبی" کہا
کہہ دیا اے سید کونین مصطفیٰؐ
دونوں عالم کو مزین کر دیا!

صہبائے لطیف' کے عنوان سے رشید احمد لاشاری نے سُر کلیان کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے، اس کے مطالعہ سے شاہ عبداللطیف کے مبلغ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے اچھوتے انداز میں راہِ حق سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو جو راہ ہدایت دکھائی ہے۔ یہ ان ہی کا خاصا ہے کہ وہ اللہ کے ذکر کے فوراً بعد سرکارِ دو عالمؐ کی تعریف فرماتے ہیں اور لوگوں کو تلقین بھی کرتے ہیں ؎

کٹ سے چلے جو "وحدہٗ" کی چاہ سے
ہو گئے دو نیم "الا اللہ" سے
ان کے ہونٹوں سے یہی نکلی صدا
ہیں رسولِ حق محمد مصطفیٰؐ!

سُر یمن کلیان

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ اس کائنات رنگ و بو کا خالق و معبود خدا ہے اور انسان کو ایک نہ ایک دن اس کے دربار میں پہنچنا ہے۔ یہی نظریۂ توحید بھی ہے۔ لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں کہ توحید پر ایمان اس وقت تک تکملہ کو نہیں پہنچتا، جب تک رسالت پر ایمان نہ ہو۔ اس لیے کہ خدا کے حضور سرخروئی کا ذریعہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں شاہ صاحب نے سُر کلیان کے بعد دوسرا سُر یمن کلیان، حضرت محمد مصطفیٰؐ احمد مجتبیٰؐ کی نعت و توصیف کے لیے تحریر کیا ہے۔ انہوں نے حضورؐ کی ذات کو "کارئی" کے نام سے یاد کیا ہے، جس کا مفہوم ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات اقدس ہی دنیا کی تخلیق کا ذریعہ ہے ؎

ہر عبادت میں خیالِ یار ہے
اس کا ہر اک طالبِ دیدار ہے
سب سے ہیں آنکھیں مقدم عشق میں
یار کی صورت سے ان کو پیار ہے

یمن کلیان کے لغوی معنی طمانیتِ قلب کے ہیں اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نزدیک حضور سرورِ کائناتؐ سے بڑھ کر طمانیتِ قلب کا ذریعہ اور کوئی ذات نہیں۔ آپ سُر یمن کلیان میں فرماتے ہیں کہ جو خدا کو نہیں مانتا اور رسالت مآب پر ایمان نہیں لاتا وہ گمراہ ہے۔ وہ ہمیشہ قعرِ مذلت میں گرا رہتا ہے۔ سکون اس سے کوسوں دور بھاگتا ہے اور جن کے قلوب شمعِ رسالتؐ سے روشن ہوتے ہیں، وہ راحت و سکون اور آرام و چین پاتے ہیں۔ یمن کلیان ایک ایسا سُر ہے، جو رات کو گایا جاتا ہے طبیعت کا ضبط اور من کو روکنے کا اختیار ہی یمن کلیان کے حضوری اجزا ہیں اور یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سُروں میں سرِ فہرست شمار کیا جاتا ہے۔ اس سُر میں شاہ صاحب نے تصوف کے اسرار و رموز، عشقِ حقیقی کی روشنی میں بیان کیے ہیں اور اسلوبِ بیان میں خوبصورت تشبیہوں سے کام لیا ہے۔ انگارے ان کے خیال میں حکمت اور شرابِ عشقِ حقیقی ہے اور ان ہی دو راہوں پر چل کر سالکانِ طریقت نشۂ الفت میں سرشار رہتے ہیں۔ اس سُر کی شاعری بہت حد تک مولانا رومؒ کی شاعری کے قریب ہے۔

سُر کھمبات

یہ سُر، ایک بندرگاہ کے نام سے موسوم ہے۔ پانی کی لہروں پر چاند کا جب عکس پڑتا ہے تو محبوب کی جبیں کا تصور ابھر کر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ چاند اور چاندنی یوں تو ہر زبان کی شاعری کا موضوع رہے ہیں میر تقی میرؔ کو چاندنی کی سیج بیکل کر دیتی تھی: درد و زور تھ چاند رات میں سارا وقت پھولوں کو دیکھ کر گزار دیتا تھا۔ الغرض ہر زبان کے شعراء نے چاند اور اس کی روشنی کو مختلف معانی پہنائے۔ چاند کی جبیں کی توصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ اس کی حسین، نرم، میٹھی اور پاکیزہ روشنی کو اپنے تصورات میں سمو لیا، لیکن شاہ عبداللطیف بھٹائی نے چاند کے وجود کو اپنے محبوب کے وجود کا ایک ٹکڑا قرار دے کر اپنی فکر کو ایک اچھوتا اور انوکھا انداز بخش دیا۔ وہ سُر کھمبات میں اپنے محبوب کے رخِ جمال

کو چاند سے زیادہ روشن اور پر نور کہتے ہیں۔ اس لئے کہ عشق حقیقی کے معاملات ہیں ان کے دل کی باتیں ہیں حفیظ ہوشیار پوری نے ان کے ایسے ہی جذبات کی ترجمانی یوں کی ہے ؎

رُک جائے اگر شب گریزاں
آجائے وہ رشک صبح خنداں

اے کاش ابھی نہ ختم ہو رات　　جلتی رہوں مثل شمع سوزاں
سو بار جلوں، بجھوں، جلوں پھر　　میں صورت آتش عنبر بہاں
محبوب کی آگ اور مرا دل　　کیا اس کو سمجھ سکے گا انساں
محبوب کا درد چپارہ گر دل　　اور مجھ کو ہے جستجوئے درماں
معراج کمال آرزو ہے،　　سید کی نوازش فراواں

رک جائے اگر شب گریزاں
آجائے وہ رشک صبح خنداں

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر کھمبات میں اپنے جس محبوب کا ذکر کیا ہے، وہ دل آویزی سے بلند و بالا ہے۔ اس کی محبوبیت بھی پاکیزہ اور ارفع معیار کی ضامن ہے۔ اسے اگر اس جہان رنگ و بو کی حسین ترین اور افضل ترین تخلیق کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ شاہ صاحب کے مداحوں کی اکثریت کی رائے میں ان کا ذات والاصفات محبوب، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اس محبوب کے حضور مودب ہو کر جاتے ہیں اور آسمان کے چاند سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں،

اے چاند
تو میرے محبوب سے کمتر ہے،
تم میرے محبوب کے حضور ضرور جانا۔
مگر مودب ہو کر
اور میرے محبوب کو انتہائی احترام کے ساتھ میرا پیغام محبت پہنچانا۔

سر کھمبات میں شاہ عبداللطیفؒ نے کہیں کہیں انسان کے جسم کو اونٹ سے تشبیہہ دی ہے وہ اپنے مریدوں کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ تم بھی اونٹوں کی طرح کھانے کی چیزوں کو بار بار گردن پھرا کر مت دیکھو۔ یعنی اونٹ مت بنو اور پیچھے مت دیکھو تم، قائم علی الصراط ہو اور دیکھتے رہو کر آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ ؟

سُر سورٹھ یہ سر ایک رانی کے نام سے موسوم ہے، جس نے وقت کے راجہ کو اپنے دام تزویر میں جکڑ لیا تھا۔ ایک دن ایک عطائی آیا۔ اس عطائی کے ساز کی سحر آفریں آواز سے راجہ مبہوت ہو گیا اور اس نے عطائی سے کہا کہ وہ انعام میں منہ مانگا انعام دینے کو تیار ہے عطائی نے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیئے، سوائے تمہارے سر کے۔ راجہ اپنا قول دے چکا تھا۔ وہ بہت متفکر ہوا، مگر اسے قول نبھانے کے لیے اپنا سر دینا ہی پڑا۔ راجہ کا سر کٹنے کے بعد اس کی رانی اور درباری کسی دوسرے شہر میں چلے گئے۔ جہاں ساز و نغمے کا نام و نشان نہ تھا۔ دفعتاً لوگوں نے سنا کہ رانی بھی چتا کی آگ میں جل گئی۔ اس پر عطائی نے راجہ کا سر اس کے جسم پر واپس کر دیا۔ وہ رانی، جو اس کے سر کو اپنے بوجھ سے دبائے ہوئی تھی، اٹھ گئی اور اس کا سر بلند ہو گیا، اور ایک بار پھر فضا میں نغمے گونجنے لگے۔ یہی نغمے سر سورٹھ کہلاتے ہیں۔ یہ سر ایک لطیف داستان ہے ایک سوز ہے، المیہ ہے۔ غلغلہ ہے اور ہنگامہ ہے۔

سر سورٹھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ایک سبق آموز نتیجہ نکالا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ موت کا وقت معین ہے، خواہ اس کا تصور انسان کے لیے کتنا ہیبت ناک ہی کیوں نہ ہو۔ وقت گزر سکتا ہے۔ مگر موت لازمی ہے انسان آہ و بکا کرے، التجائیں کریں، خوشامدیں کریں، لیکن سب بے سود ثابت ہوتا ہے۔ پس بندے پر لازم ہے کہ اپنے رب کو ہر لمحہ یاد کرے اور اس کی عبادت سے منہ نہ موڑے۔

سُر آسا یہ سر امید کا سر ہے اور اس میں اس شخص کا ذکر ہے، جو خود پسند ہو اور اپنا دل اللہ کو بھی دینا چاہتا ہو۔ اس سر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں کہ جس شخص کے سر میں "ہمچو ما دیگرے نیست" کا سودا سما گیا ہو۔ وہ عشق الٰہی کی لذت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ یہ امید ہے، جو دنیا کی آلائشوں کے بعد جنت کی بشارت دیتی ہے۔

سر آسا میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے حقیقت افروز اور ایمان پرور باتیں کی ہیں کہ صالح اور پاکیزہ زندگی گزارنے، حرص و ہوس سے دور رہنے اور نفس امارہ کو قابو میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان ارشادات الٰہی پر عمل پیرا ہو۔ شاہ عبداللطیف صاحب دل صوفی تھے۔ انہوں نے رسالہ شاہ جو میں تصوف کی جو فکر انگیز اور ایمان افروز باتیں کی ہیں، اس سے ان کا رسالہ تصوف کے اصولوں اور معنویت کا گہوارہ بن گیا۔ وہ جگہ جگہ پر انسان کو نیکی کا درس دیتے ہیں، اور نفس کے چنگل سے رہائی پانے کے لیے راہ صدق اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اس سر میں انہوں نے شریعت محمدی کی پابندی کرنے اور وحدت الوجود پر یقین کامل رکھنے پر بھی زور دیا ہے۔

سُر سریراگ اس سر میں کشمکش حیات کی داستان کا ذکر ہے۔ انسان کی زندگی کیا ہے، ایک عمیق سمندر، اس سمندر میں سونا، سیپ اور موتی بھی ہیں اور طوفان بلا خیز بھی، زندگی، جہاں پھول ہے۔ وہاں اس کے ساتھ خار بھی ہیں۔ زندگی صرف آسائشوں سے عبارت نہیں، بلکہ اس میں مشکلات بھی ہیں۔ کامیابیاں، ناکامیاں اور خوشیاں اور مایوسیاں، حیات انسانی میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سر سریراگ ان ہی حقیقت آموز نکات کا مظہر ہے۔ اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ زندگی کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر وہی کامیاب ہوتا ہے، جسے بحر بے پایاں میں غواصی کا ادراک حاصل ہو۔

سر سریراگ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ہر انسان کو چوکس و ہوشیار رہنے کی تلقین کی ہے۔ یہ راگ ان لوگوں کی داستان دہراتا ہے، جو اللہ کا نام لے کر اپنی کشتیاں سمندر کی بلا خیز موجوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہ محنت اور عرق ریزی سے سیپیاں نکالتے ہیں اور ان کی قیمت کا سودا کرتے ہیں۔ یہ کار دشوار ہے۔ انسان کو ہزاروں خطرات میں گھرنا پڑتا ہے۔ بھنور سد راہ بنتے ہیں۔ طوفان راستہ روکتے ہیں، اور بلائیں لرزہ و خوف طاری کر دیتی ہیں۔ شاہ عبداللطیف کے نزدیک اگر جذبہ ایمانی کامل ہو اور ہمسفر ہو، تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ سر سریراگ میں شاہ صاحب نے اس جذبے کی تعریف کی ہے۔ یہ جذبہ خوابیدگی سے گریز کا درس دیتا ہے اور تغافل شعاری اس جذبے کے سامنے قابل نفرین ہے۔

سُر سامونڈی سر سریراگ سے یہ سر ملتی جلتی ہے۔ اس کا موضوع بھی سمندر اور بنجارے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس سر میں حکمت افروز باتیں کی ہیں اور مکارم اخلاق کا اعلیٰ درس دیا ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ مثالی کردار کے حامل وہی لوگ ہوتے ہیں، جو پاک طینت ہوں اور جنہیں تعلی اور تصنع سے نفرت ہو۔ ایسے

لوگ نیکی اور سچ کو اپنا شعار بنالیتے ہیں۔ اور زندگی کے بحرِ ذخار سے صداقت کے موتی ڈھونڈ نکال لاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے سرسامونڈی کا ترجمہ شیخ ایاز نے اردو میں کیا ہے۔ اس کے اقتباسات پیشِ نظر ہیں۔

موج در موج بحرِ بے پایاں — میرے محبوب کی نشانی ہے
حاصل جلوہ ہائے رنگا رنگ — در حقیقت وہی روانی ہے!
ظاہری حسن کرشبات کہاں — ہر تب و تاب آنی جانی ہے

خواہش وصلِ یار کیا معنی
قرب محبوب جاودانی ہے

آزمودہ ہے جرأتِ صد شوق — دل کو اب سوگوار کون کرے
دیکھ کر جلوہ ہائے رنگا رنگ — حسن کا اعتبار کون کرے
اے خوشا لذتِ فراقِ یار — خواہش وصلِ یار کون کرے

زندگی کشتۂ محبت ہے
موت کا انتظار کون کرے،

سرسامونڈی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بتایا ہے کہ ایمان، طاقت کا سرچشمہ ہے۔ انسان حق پرستی، صداقت اور عزتِ نفس کو شعار بنالے تو وہ بیدار اور صالح زندگی گزار سکتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اس سر میں انسان کو بنجارے کے روپ میں ایک مکمل انسان دیکھنے کے متمنی ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو دنیا سے کنارہ کشی نہیں کرنی چاہیے۔ کامل انسان وہی ہے جو دین اور دنیا دونوں کا پابند ہو۔ وہ دنیاوی مسائل کا بھی ساتھ دے اور دین سے بھی منہ نہ موڑے۔

سرسارنگ اس سر کے بارے میں ڈاکٹر داؤد پوتہ رقمطراز ہیں کہ یہ سر ایک ایسی راگنی کا نام ہے، جو برسات میں گائی جاتی ہیں سر کا نام اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ساون کے مہینے سے متعلق ہے۔ رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی ہو اور اس سہانے اور نشیلے موسم میں سارنگ گایا جائے، تو کیا سماں ہوتا ہوگا۔ اور سارنگ بھی شاہ صاحب کا سُر ہو، تو برسات دو آتشہ ہو جاتی ہوگی برسات کے موسم کی رنگینیوں اور دلکشیوں سے انکار ممکن نہیں۔ اس موسم سے محظوظ ہونے کو کس کافر کا جی نہیں چاہتا۔ یہ موسم طبیعتوں میں نکھار پیدا کر دیتا ہے اور اس سے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ برسات نہ ہو تو اک قیامت برپا ہو جاتی ہے جس کے باعث طبائع میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے، قحط کا اندیشہ الگ، ہر شے گرانی کی طرف بڑھتی ہے۔ اور انسان کے دل میں سو سو وسوسے اور اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں، لیکن جونہی برسات شروع ہوتی ہے۔ موسم کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات نکھر نکھر آتے ہیں۔ انسان تو کیا، ہر جاندار کو برسات کی خوشی ہوتی ہے۔ اسی خوشی اور اسی موسم کو شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سرسارنگ میں بیان کیا ہے۔

اس سر میں تشبیہات اور استعارات سے کام لیا گیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نزدیک برسات کی آمد آمد، کفر کی گھٹاؤں میں اسلام کی تیرگی کی علامت ہے۔ روشنی پھیل جاتی ہے۔ دل خدائے وحدہٗ لاشریک کی محبت سے سرشار ہو جاتے ہیں اور ایمان کے زور کی بارش ہونے لگتی ہے۔

سرسارنگ درحقیقت بنجر دماغوں کے لیے ایمان و ایقان کا ساون ہے۔ یہ سر ایسی برسات لاتا ہے کہ ہر بنجر دل میں محبوب حقیقی کی محبت کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور ہر طرف جل تھل ہو جاتی ہے۔

سرپربھاتی ہندی میں پربھات کے معنی صبح کے ہیں۔ صبح کے وقت کو صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے عبادت کے لیے اچھا اور پرسکون قرار دیا ہے، یہی وہ سماں ہوتا ہے، جب خاموش فضاؤں میں اللہ کا نور بھر جاتا ہے اور پھر مرغ کی اذان بھی، بانگ درا، کا درجہ رکھتی ہے شاہ عبداللطیف نے سرپربھاتی میں ان ہی کیفیات کو سمویا ہے۔

سرپربھاتی کی تخلیق کا موقعہ بظاہر لسبیلہ کے حاکم سپٹر سخی کی تعریف ہے، مگر اس تعریف میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے خدائے لم یزل کی بے پایاں رحمتوں کا برملا اعتراف بھی کیا ہے۔ اس کے ابتدا میں سپٹر کا نام ہے اور اس کے بعد شاہ صاحب نے حمدیہ انداز اختیار کیا ہے۔ شاہ صاحب کے بقول سپٹر کو خدا سے ہدایت ملی ہوئی تھی کہ اس کے در پہ آنے والا کوئی مستحق سائل بے نیل و مرام نہ لوٹے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سرپربھاتی میں عقیدے کی بہ نسبت اوصاف کی تعریف کی ہے مگر ان کا حقیقی اور ازلی و ابدی رشتہ خدائے بزرگ و برتر کی ذات و الا صفات سے ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے حاکم سپٹر کو صرف سر کا ذریعہ بنایا ہے اور کہا ہے کہ اسے یہ خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی نے ودیعت کی ہیں کہ وہ خلقِ خدا کی دل آزاری نہ کرے اور ہر موقع پر اس کے کام آئے۔

شاہ عبداللطیف نے سرپربھاتی میں یہ بلیغ اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا تخصیص مذہب و ملت، ہر ایک کو رزق دیتا ہے۔ وہ پتھر کے کیڑے کو بھی رزق دیتا ہے اور کافر کو بھی اس کے کفر کے سبب رزق سے محروم نہیں رکھتا۔ حاکم سپٹر غریبوں کا ہمدرد تھا، معذوروں کا مددگار تھا اور مجبوروں کا حاجت روا۔ ان غریبوں، معذوروں اور مجبوروں کی دعائیں اس کے شامل حال تھیں۔ پھر وہ خداوند جل شانہٗ کی عطا کردہ نعمتوں سے کیوں کر محروم رہ سکتا تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سربھاتی کا مرکزی خیال یہی باتیں ہیں۔

سرکاہوڑی اس سر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سالک کو کاہوڑی سے نسبت دے کر اسے ہمہ وقت بیدار رہنے کی تلقین کی ہے۔ اس سر میں انہوں نے ڈٹھ کو روحانیت اور حقیقتِ عشق کا سمبل بنایا ہے۔ شاہ صاحب کے بقول ڈٹھ ان فقیروں، صوفیوں، اور درویشوں کی غذا ہے، جو سانپ پکڑتے ہیں۔ ان کا سفر پرخطر ہوتا ہے، مگر وہ مشکلات و مصائب برداشت کرکے اپنی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں اور منزل کو پالیتے ہیں۔

سرکاہوڑی میں شاہ عبداللطیف نے سپیروں کے کردار کو موضوع اشعار بنایا ہے سپیرے ہر وقت سانپوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ جنگلوں میں پھرتے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے ہیں اور صحراؤں میں اپنی بین کی سریلی لے سے سانپوں کو مبہوت کرکے پکڑ لیتے ہیں۔ ان پر سانپوں کے زہر کا بھی اثر نہیں پڑتا۔ شاہ صاحب کے ہر سر میں ان کی روحانی آواز ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ سالک کو کاہوڑی سے نسبت دیتے ہیں اور 'لامکاں' ان کے نزدیک صوفیائے کرام کی معنوی منزل یا قیام گاہ ہے۔ یہی وہ منزل ہے، جس پر جادہ پیما ہو کر سالک راہِ حقیقت، منصبِ معرفت تک پہنچتا ہے اور اسے اس کی منزل مقصود مل جاتی ہے۔

سرکاہوڑی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ان صوفیائے کرام پر بھی تنقید کی ہے، جو اپنے مسلک کو نہیں پہچانتے۔ وہ صرف نام کے صوفی رہتے ہیں اور ان کے ظاہر و باطن میں مذاق کی حد تک حدِ فاصل ہوتی ہے۔

سررام کلی شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی عمر کے تقریباً تیس سال سیاحت میں گزارے۔ اس سیاحت کے دوران وہ صوفیائے کرام، سالکین اور

درویشوں سے ملے۔ کئی سادھو اور فقیر، سلوک و معرفت کی منزل میں ان کے شریکِ سفر رہے۔ اس سفر و سیاحت میں شاہ صاحب کے مشاہدات کیا تھے؟ "سُر رام کلی" میں ان کی مکمل تفصیل موجود ہے۔ بالفاظِ دیگر "سر رام کلی" ان کا تیس سالہ سیاحت نامہ ہے۔ رسالہ شاہ جو، میں ویسے تو انہوں نے اپنے مشاہدات ہی قلمبند کیے ہیں۔ لیکن سر رام کلی میں ان کے سفر کے مشاہدات عملی تجربات کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں ہمسفر ساتھیوں کے ساتھ گزارے گئے لمحات اور ان کے احوال کا بیان ہے۔

شاہ عبداللطیف نے اس وقت جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت اختیار کی جب وہ عنفوانِ شباب میں تھے عمر اکیس سال تھی۔ تقریباً تین برس تک ان کے ساتھ رہے۔ جوگ لیا جسم پر بھبھوت اور خاک ملی۔ اپنے آپ کو اذیتیں پہنچائیں۔ بھوک اور پیاس کی شدت کو محسوس کیا۔ کالی دیوی کے پجاری بنے۔ پرمیشور کے نام لیوا ہوئے۔ مگر یہ سب کچھ دل کی تپش اور ایمان افروزی کے جذبے کی تسکین و طمانیت کا باعث نہ بن سکا اور شاہ صاحب نے جوگیوں اور سنیاسیوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ صوفیہ کے ہم مسلک و ہم نشین ہوئے یہ راہ انہیں آسان اور روشن دکھائی دی اور وہ حق کے شیدائیوں میں شمار ہو گئے۔

سر رام کلی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ایسے ہی تجربات کا حال بیان کیا ہے۔ اس سر میں انہوں نے سلوک و معرفت کی گتھیاں سلجھائی ہیں اور حکیمانہ اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات کی رو سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہر مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک لفظی یعنی ظاہری اور دوسرا معنوی یعنی باطنی۔ مختلف مذاہب کی ظاہری راہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر ان سب کی معنوی یعنی باطنی راہ ایک ہی ہوتی ہے اسلام کو فوقیت حاصل ہے کہ اس میں دل کے رشتے قدرے مربوط و مستحکم ہوتے ہیں۔ اس سر میں شاہ صاحب نے نفس کش کو طریق اور تصوف کے اصولوں کو اپنانے کی پہلی شرط قرار دیا ہے اور جگہ جگہ خودی کے عمل کو تیز اور خود غرضی کو فنا کرنے کی تلقین کی ہے۔

سر رام کلی میں شاہ عبداللطیف نے شرفِ انسانیت کو اقوام و ملل کی تاریخ میں سرِ فہرست قرار دیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا ہے کہ انسان کا وجود اپنے حقیقی محبوب کا ایک جزو ہے اور اس جزو کو ایک نہ ایک دن کل میں شامل ہونا ہے۔ تصوف کے اس نکتے کو اولیائے کرام نے بھی بیان کیا ہے۔

سر رام کلی کے دوسرے حصے میں، جو کہ ضمنی ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ان جوگیوں اور ہم جلیسوں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے گنجو ٹکر کی پہاڑی میں ان کے ساتھ بارہ راتیں اور بارہ دن گزارے۔ یہ حصہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

سر پورب شاہ عبداللطیف بھٹائی کی یہ سر پنجابی زبان، ادب اور معاشرہ کے بہت قریب ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں کی قدیم روایات میں کوتے کا ذکر بہت ملتا ہے۔ مثلاً

اڈدا تے جا نویں کانواں
بھندا دی جائیں وے!
بھندا جائیں میرے پیکڑے

(ترجمہ) "اے کوّے، تم اڑتے ہوئے جاؤ، تو ذرا میرے میکے سے بھی ہوتے جانا"
پنجابی ادب کی طرح سندھی ادب میں بھی شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کوّے کو مقاصد کی حیثیت دی ہے۔ اس کا ذکر سر پورب میں دو حصوں میں ملتا ہے۔ کوّے کے لیے کانگ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک قصے میں کوا، قاصد بن کر پردیوں کو پیغام پہنچاتا ہے اور دوسرے قصے میں شاہ عبداللطیف نے پوربیوں اور جوگیوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ قصہ سر رام کلی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب چونکہ سندھ کے دیہاتوں کی رسم و رواج سے بخوبی آشنا تھے، ان کے نزدیک کوّے کو دیہات کی ان رسوم و روایات میں بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے انہیں کوّے کے سوا پیامبری کے لیے اور کوئی پرندہ بہتر نظر نہ آیا۔ کوا بظاہر ایک سیانا اور مکار پرندہ ہے۔ مگر اہلِ دیہات اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اسے محبوب تک رسائی کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف کو دیہات کے لوگوں کو ان کی زبان میں سادہ اور سلیس انداز میں کچھ باتیں بتانا مقصود تھیں، سو انہوں نے کوّے کو ذریعہ اظہار بنایا اور ایسی ایسی باتیں کہہ گئے، جو پند و نصائح کا خزینہ ہیں۔

سُر بلاول موضوع کے اعتبار سے تو یہ ایک سر ہے مگر مندرجات کے لحاظ سے یہ ایک قصیدہ ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے قصیدے کو ادب کی تاریخ میں جو قدیم ترین صنف کی حیثیت حاصل ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر بلاول میں اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ زمانۂ سلف کے واقعات شاہد ہیں کہ پیشہ ور شاعر اور داستان گو مال و متاع اور جاہ و منصب کے حصول کی خاطر قصیدہ گوئی کرتے رہے، مگر شاہ صاحب کی ذاتِ گرامی قدر ان مراعات و فروعات سے بالا تھی۔ ان کا کردار مثالی تھا۔ وہ خوشامد اور چاپلوسی سے نفرت کرتے تھے۔ اچھائی کو اچھا اور برائی کو برا کہنا ان کا مسلک و شعار تھا۔ اس لیے انہوں نے سر بلاول میں کامیاب قصیدہ کہہ کر ایک نیا تجربہ کیا۔

سر بلاول کا اسلوبِ نگارش سندھی زبان کے قصائد سے یکسر مختلف ہے۔ وہ جس ہستی کے بارے میں قصیدہ لکھنا چاہتے ہیں پہلے اس ذات انوار تجلیات کی تعریف کرتے ہیں جن کی خاطر اللہ جل شانہٗ نے اس جہان رنگ و بو میں اپنی کائنات کی رنگینیاں اور جلوہ افروزیاں پیدا کیں۔ شاہ صاحب کی مراد حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سے ہے، جنھوں نے بنی نوعِ انسان کو اچھے اور لائقِ توصیف خصائل سکھائے۔ پھر وہ جام بجھری، کی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں۔ یہ خوبیاں انہیں معتبر اور مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوتی ہیں۔

سر بلاول کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں تین داستانیں ہیں۔ ان میں سمہ کے جام بجھری کی جود و سخاوت، ہمت و شجاعت، بہادری و دلیری پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ متعدد بیتوں پر محیط ہے۔ ہر بیت دوسرے سے منضبط و مربوط ہے، جس سے سر بلاول ایک اعلیٰ پایۂ کا قصیدہ بن گیا ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس گفتگو اور بحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جو شاہ صاحب درد یا دگند سے کیا کرتے تھے۔ سارے قصیدے میں انہوں نے کسی جگہ بھی خوشامد اور تعلق سے کام نہیں لیا۔ ان کے کلام میں کہیں بھی اس امر کا شائبہ تک نہیں ہوتا کہ انہوں نے زیبِ داستاں کے لیے جام بجھری کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہو۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی قصیدہ گوئی میں کہیں بھی اپنے مقام اور مرتبے سے نیچے نہیں آئے اور انہوں نے بندے کی تعریف کو معبودِ حقیقی کی صفات کا پر تو قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ، جب گایا جاتا ہے، تو لوگوں کی بے قرار دھڑکنوں اور بے چین جذبات کو ایک گونہ طمانیت مل جاتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی سے قبل کسی بھی سندھی شاعر نے مسرت و ظرافت کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا تھا، حالانکہ حیاتِ انسانی، مسرت و ظرافت کے بغیر بے کیف نظر آتی ہے۔ شاہ صاحب انسانی نفسیات کے بہت قریب تھے۔ اس

یے انہوں نے سر بلاول کے دوسرے حصے میں ظریفانہ شاعری سے ہی ابتدا کی ہے۔ ان کے اس اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قنوطیت پسند نہیں تھے بلکہ انہوں نے سر بلاول میں تکنیک اور جدت طرازی کے تجربوں کو بھی آزمایا۔ اس لحاظ سے وہ تجسس آخر آئے پسندی اور جدت طرازی کے قائل تھے۔ سر بلاول سے ان کی طبیعت کی فراوانی، قلب کی کشادگی اور ذہن کی بلندی کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

سُر بروو سندھی

یہ سر ہندی راگنی کے بہت قریب ہے۔ اس لیے ہندی راگنی بروو میں کچھ تبدیلی کرکے اس کا نام سر بروو سندھی رکھا گیا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس سر میں بتایا ہے کہ روح کے بغیر انسان کی زندگی بیکار ہے، مگر روح کی تسکین کے لیے خدائے بزرگ و برتر کی اطاعت، ریاضت اور عشق ضروری ہے۔ اس سر میں یہ عقیدہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بندے اور مومن میں فرق کیا ہے بقول اقبال ؎

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ

مومن کی تعریف میں حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی بہت کچھ کہا ہے۔ مثال کے طور پر ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

اور شاہ عبداللطیف بھٹائی مومن کی تعریف میں کہتے ہیں کہ وہ صرف اپنے رب سے لو لگاتا ہے۔ اس کی خاطر اسے مشکلات کی وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ صحرا نوردی کرنا پڑتی ہے، مگر وہ ریاضت سے منہ نہیں موڑتا ہر وقت اللہ کے نام کی مالا جپتا ہے۔ اس کی راہ میں خار دار جنگل بھی آئیں، تو گل و گلزار بن جاتے ہیں۔ بالآخر وہ اس خیابان میں بسیرا کرتا ہے، جہاں آسودگی اور روحانی ترفیع کی کلیاں کھل رہی ہوں۔

سر بروو سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے شرک سے بچنے کی بھی تلقین کی ہے اور کہا ہے "سالک کو چاہیئے کہ وہ عقیدت میں اس حد تک نہ ڈوب جائے کہ وہ شرک کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائے"۔ بنابریں انہوں نے اس فانی دنیا کی بے ثباتی کا حال بھی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"دل کی حرکت بند ہو جائے، تو دنیا والے آدمی کو بے قدر و قیمت سمجھنے لگتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ جسم کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور دنیا سے محبت بے معنی ہے۔ دنیا کی اس بے مہری کا مقابلہ کرنا ہو تو روح کی عاجزی اور بے قراری کو زندہ رکھو۔ دل کی حرکت بند ہو سکتی ہے، مگر روح کبھی نہیں مر سکتی"۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس سر میں بنی نوع انسان کی تخلیق سے لے کر فلسفۂ انسانیت تک کو بیان کیا ہے اور شرف آدمیت کے لیے ابدی زندگی اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔

سُر رب

بروو سندھی، کی طرح سر رب میں بھی جسم اور روح کے فلسفے کی حقیقتوں کو اجاگر کیا گیا ہے رب بظاہر کسی راگنی کا نام نہیں، اس سے مصیبت کا وہ مفہوم عبارت ہے، جو پہاڑ کے برابر ہو یا ایسا دشمن، جو ڈراتا ہو کہ انسان کا دل دہل جائے۔ یہ نام اس لیے تجویز کیا گیا ہے کہ اس میں ہجر و فراق کے مضامین کو باندھا گیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہجر و فراق کا غم بہت ہولناک اور اس کا بار پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔

مولانا روم نے اپنی مثنوی میں روح اور بانسری کو ایک معنی عطا کیے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ روح کی آہ و زاری کا حقیقی سبب رب سے جدائی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی سر رب میں سالک کی روح کو اس درجہ بیقرار دکھایا ہے کہ وہ آہ و زاری کرتی ہے۔ اس کی اس آہ و زاری کا جواز کیا ہے؟ یعنی وہ اپنے مرکز سے بچھڑ چکی ہے۔ مرکز سے شاہ عبداللطیف کی مراد ذات حقیقی ہے۔ ہر شے کو اپنے مرکز سے جدا ہونے کا ملال ہوتا ہے۔ یہی ملال جب ہجر و فراق کی غم انگیز کہانی بن جاتا ہے تو شاہ عبداللطیف بھٹائی اسے سر رب میں ڈھال دیتے ہیں۔

یہ سر درحقیقت ایک 'برہا' کی فریاد ہے۔ نالہ درد ہے، اشک فراق ہے، نوحہ بانسری ہے، عشق میں فراق کی منزل ایسی بھی آتی ہے کہ چھپائے نہ بنے اور آنسو نکل ہی آتے ہیں۔ اسی غم دل کو محسوس کرتے ہوئے اردو کے شاعر مرزا غالب نے کہا تھا ؎

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مگر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر رب میں ہجر و فراق کی بات بنائی ہے اور خوب بنائی ہے۔ ان ہی کے کلام کا آزاد نظم میں ترجمے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں ؎

میں کہ ایک شاخ ہوں
درخت سے کٹی ہوئی
کبھی درخت کا ایک جز تھی
اور اب جدائی کے صدمے نے میرے سینے کو چھلنی کر دیا ہے
میرے سینے میں
درد بھری آواز کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے لبوں پر
فراق کے نالے ہیں۔
دل میں جدائی کا غم ہے۔

سُر کاپائتی

اس سر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے معرفت کے گل کھلاتے ہوئے تصوف کے اصول بیان کیے ہیں۔ یہ اصول سالک اگر حرز جاں بنا لے تو اس کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے شاہ صاحب کے مداحوں کے خیال میں سر کاپائتی ان لوگوں کے لیے، جو مرشد کی تلاش میں ہوں، یہ سر کاپائتی صحیح معنوں میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ سر کے ابتدا میں کاپائتی کی محبت اور اس کی ذاتی مصروفیات کا ذکر ہے۔ اس مناسبت سے اس سر کا نام کاپائتی رکھا گیا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر کاپائتی میں انسانوں کو اللہ سے لو لگانے اور اس کے احکامات پر عمل کرنے کی بھرپور تلقین کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حشر کے دن وہی اپنا اعمال نامہ سرخروئی کے ساتھ پیش کر سکے گا جس نے اپنے رب کی عبادت میں بخل سے کام نہیں لیا ہوگا جس شخص کی نیکیاں زیادہ ہوں گی۔ اس کا دل نور کی شعاعوں سے متمتع ہوگا۔ عبادت میں اطاعت کو شاہ صاحب ناگزیر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو ناز چھوڑ کر نیازمندی کا وطیرہ اختیار کرنا چاہیئے کہ نیازمندی ہی انسان کی منزل ہے، جس سے اسے پذیرائی ملتی ہے۔

بزرگان دین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی عبادت کی ضرورت نہیں۔ عبادت تو خود بندے کی ضرورت ہے جس کی رو سے وہ رب تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ یہی عبادت اس کی بقا اور بخشش کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ شاہ عبداللطیف کہتے ہیں کہ

کسی بھی انسان کو اپنی عبادت پر فخر نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اسے عاجزی اور نیاز مندی کا طرز اپنانا چاہیئے۔ اس کی مثال انہوں نے ایک پھلدار شاخ سے دی ہے، جو جھکی ہوتی ہے۔ شاہ عبداللطیف کہتے ہیں کہ عبادت اور ریاضت میں اطاعت و عاجزی سے انسان کو جو پھل ملتا ہے، وہ بہت لذیذ اور شیریں ہوتا ہے۔

سر کارایل مور یا ہنس کو 'کارایل' کہتے ہیں، جو اپنی برادری میں انفرادی حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس سر میں کارایل کو سمبل بنا کر ان بزرگوں کا ذکر کیا ہے، جو مرشد کامل بننے اور کہلانے کے لائق ہوں۔ جس طرح پرندوں کا سردار 'کارایل' سب سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے، اسی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نزدیک حضورؐ اکرم کی ذات گرامی ہر اعتبار سے جاذب نگاہ اور قرار دل و جاں ہے۔ جس طرح ہنس متعفن اور تھوڑے پانی کے تالاب میں گزر نہیں سکتا۔ اسی طرح وحدت کے شیدائی مرشد معمولی لگن کے قائل نہیں ہوتے بلکہ وہ ہر وقت عشق میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ان کا رواں رواں عبادت الٰہی میں مستغرق رہتا ہے۔ ہنس تہہ میں پہنچ کر اپنی غذا کا سامان کرتا ہے۔ یہی مثال ان مرشدان کامل کی ہے۔ روحانی معراج کی خاطر عشق کے اتھاہ سمندر میں غواصی کرتے ہیں۔ مزید براں ہنس کو کوؤں کی صحبت پسند نہیں ہوتی۔ اس موضوع کو علامہ اقبالؒ نے شاہین اور کرگس کے نام دے کر مضمون میں رس باندھا ہے ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اچھوتے اور منفرد انداز تکلم میں ہنس یا مور کو موضوع سخن بنا کر سالکین کو راہ حقیقت دکھائی ہے اور انہیں موتیوں کی تلاش میں تن من کی بازی تک لگانے کی تلقین کی ہے۔ 'سر کارایل' حقیقت میں شاہ صاحب کی جدت طرازی اور فکر انگیزی کا ثمر ہے۔

سر گھاتو گھاتو کا لفظ سندھی زبان میں گھلت سے نکلا ہے اور اس کے معنی شکاری کے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس سر میں مچھیروں کا ذکر کیا ہے، جو ایک طور پر شکاری کہلاتے ہیں۔ شاہ صاحب کے تمام سر کسی نہ کسی مناسبت کے آئینہ دار ہیں، اس لیے مچھیروں کا سُر، گھاتو کے نام سے موسوم ہے دیگر سروں کی طرح اس سر کے پس منظر میں بھی ایک کہانی ہے۔ اس کہانی کے سب کردار مچھیرے ہیں شاہ صاحب نے ان کرداروں کو تمثیلی بنا کر پیش کیا ہے۔

سر گھاتو میں 'نفس' کو مگرمچھ کا نام دیا گیا ہے۔ مگرمچھ، سمندر کی ہر شے کو نگل جاتا ہے۔ یہی بیّن مثال انسان پر صادق آتی ہے۔ اس کا نفس بھی اسے راہ نجات سے بہت دور لے جاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے نفس کو مارنے کی ان الفاظ میں تلقین کی ہے کہ مرنے سے پہلے مر جاؤ یعنی اپنے نفس کو مار لو۔ چنانچہ نفس کو مارنے کے لیے شاہ صاحب نے سر گھاتو میں چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا ذکر کیا ہے اور اس کہانی کا موثر نتیجہ نکالا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نفس کشی کے لیے صوم و صلوٰۃ کے چھوٹے ہتھیار اس قدر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے کافی ریاضت اور پیہم عبادت کی ضرورت ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے سر گھاتو میں انسان کو 'کان' سے تشبیہ دی ہے۔ کان میں بیش بہا اور بیش قیمت خزینے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کے اندر بھی روحانی ذخائر کی کمی نہیں، جن پر مگرمچھ منہ کھولے بیٹھا رہتا ہے۔ پنجابی ادب میں بھی جن کہانیوں میں دولت کی دیگ اور اس پر پہرہ دینے والے خونخوار سانپ یا اژدھے کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح شاہ صاحب نے بیش قیمت کان کا پہرہ دینے والے مگرمچھ کے متعلق بیان کیا ہے۔ اگر انسان اس سانپ یا مگرمچھ کو مارے، تو وہ یہ ساری دولت حاصل کر لیتا ہے۔ گویا وہ اپنے نفس کو مارے، تو اسے روحانیت کی وہ ساری دولت مل جاتی ہے جس کا وہ تمنائی ہو۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی یہ تمثیلی کہانی بہت خوبصورت، فکر انگیز اور نتیجہ خیز ہے۔ اس کہانی سے بہت سی فرسودہ معاشرتی روایات کی نفی بھی ہوتی ہے اور ایسے واعظان کے کرداروں کا بھید بھی کھل جاتا ہے، جو سادہ لوح لوگوں کو کان کے خزانے، دیگ کی دولت کے حصول اور محض صوم و صلوٰۃ کی پابندی کا درس دیتے رہتے ہیں۔ ایسے واعظ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے نہیں۔

سر ڈھر سندھی زبان میں 'ڈھر' ریت کے ٹیلے کو کہتے ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اسے ایک خاص سر کا نام دیا ہے اور اس میں مختلف موضوعات پر بیت کہے ہیں۔ یہ سر کئی حصّوں میں ہے۔ ایک حصّے کا نام انہوں نے 'کنڈی' سے مخاطب ہو کر انہوں نے بہت سی کام کی باتیں معلوم کی ہیں اور پھر مگرمچھ کی طرح خود پانی میں موت کا شکار بن جانے پر تنبیہہ بھی کی ہے۔ ایک دوسری داستان میں انہوں نے حضور سرکار دو عالمؐ کی عظیم ترین اور مقدس ترین ذات کو مشکل کشا کہہ کر مشکل کشائی کے لیے پکارا ہے، شاہ عبداللطیف اس مرحلے پر اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور ہی نجات و بخشش کا ذریعہ ہیں۔

سر ڈھر کی تیسری داستان خواب خرگوش کے مزے لوٹنے والے سالک سے متعلق ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ فرماتے ہیں کہ غفلت اور گہری نیند، سالک کو اس کے مسلک سے کوسوں دور لے جاتی ہے اور اس غفلت کے تکلیف دہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ چوتھے حصّے میں کونجڑے کی باہمی محبت کا ذکر ملتا ہے۔ کونجڑے پرندوں کی ایک جوڑی ہے، جو اپنی محبت کے ساتھ ساتھ صیاد کی سنگدلی پر افسوس بھی کرتی ہے۔ عبداللطیف بھٹائیؒ کا کہنا ہے کہ شکاری جب نر پرندے کا شکار کرتا ہے تو اس کے زخم مادہ بھی محسوس کرتی ہے۔ بیّن مثال عاشق اور معشوق کی ہے۔ اسی حصّے میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے آخر میں لاکھے اور اس کی گھوڑی لکھی کا حال قلم بند کیا ہے۔ ساری سر ڈھر میں جگہ جگہ دعائیں اور التجائیں ملتی ہیں اور خدا کی کرشمہ سازیوں اور حکمتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔

سر ڈھر میں مگرمچھ کا بیان تمثیلی انداز میں ہے۔ وہ یوں کہ سیلاب آنے پر ایک بڑا مگرمچھ ایک مہیب گڑھے میں جا گرتا ہے۔ سیلاب کا زور کم ہونے پر بھی وہ مگرمچھ گڑھے سے نکل نہیں پاتا۔ شاہ عبد لطیف نے سر ڈھر میں دنیا کو گڑھے سے تشبیہہ دی ہے۔ اور مگرمچھ کے کردار کو سست سالک کے مماثل قرار دیا ہے، وہ سست اور غفلت شعار سالک، جو ذرا سی ٹھوکر کھانے کے بعد ساری عمر عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس موقع پر سالک کو چوکس اور بیدار رہنے کا درس دیا ہے اور اسے دنیا کے گڑھے سے نکلنے کی تلقین کی ہے۔

سُر کاموڑ حمد و ثنائے رب جلیل، نعت رسول مقبولؐ، تذکرہ بزرگان کرام اور سلوک و معرفت کے علاوہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی بہت سی سریں ایسی ہیں، جو ان کی داستانوں پر مبنی ہیں۔ ایسی ہی داستانوں یا سروں کے لیے شاہ صاحب نے ایک دوسرے کا انتخاب کیا۔ سر کاموڑ، ان سب روحانی سروں میں سر فہرست ہے۔ نوری جام تماچی کی داستان اس سر کے گرد گھومتی ہے اور اس کے بین السطور بندے سے خدا کے عشق کی ایک عظیم تمثیل بیان کی ہے اردو اور فارسی میں تمثیلی اور مکالماتی نظمیں موجود ہیں۔ علامہ اقبال کا 'شکوہ جواب شکوہ' اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ سر کاموڑ اسی

شکوہ جواب شکوہ کے بہت قریب ہے۔

سر کاموڈ میں شاہ عبداللطیف نے حقائق و معارف کے موتی بکھیرے ہیں۔ تصوف کی زبان میں طلب کی باتیں کی ہیں۔ یہی طلب، تڑپ کے روپ میں ہر نیک بندے میں موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے نوری اور جام تماچی کے مکالمات کو شکوہ جواب شکوہ کے انداز میں نظم کیا ہے۔ نوری ایک جوان مچھیرن ہے۔ جس کے حسب نسب کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ریاست کا حکمران جام تماچی اس کی نرگسی اور ادھ کھلی آنکھوں میں ادب اور نیاز مندی کی چمک دیکھ کر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ نوری غلاظت کے ڈھیر میں، بدبودار ماحول میں بیٹھ کر مچھلیاں بیچتی ہے۔ اور جام تماچی اسے وہاں سے اٹھا کر اپنے محل کی زینت بنا لیتی ہے۔ اب یہی نوری، جام تماچی کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور بن جاتی ہے۔

شاہ عبداللطیف نے عشق کے مراحل کو مکالمات کا رنگ بخشا ہے اور سر کاموڈ میں ثابت کیا ہے کہ جذبہ عشق کی تکمیل کی خاطر انسان کو کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے، تب وہ کندن بنتا ہے۔ نوری شکوے کے انداز میں جام تماچی سے مخاطب ہوتی ہے اور جام تماچی جواب شکوہ میں اس کی عاجزی اور انکساری کو بھی سادگی اور حسن کا نام دیتا ہے۔ یہ ساری تمثیل بامعنی ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس کے نتیجے میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہری خوبصورتی، وجاہت، شان و شوکت، طمطراق کو پسند نہیں کرتا، بلکہ دل کی پاکیزگی، طمانیت اور جذبے کی روحانیت کو دیکھتا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ اگر انسان ظاہری ٹھاٹھ باٹھ چھوڑ کر اپنے آپ کو غش صفاتی سے مستقل کرے اور عجز و نیاز اور حلیمی و بردباری کو اپنا لے، تو اس کا رتبہ دنیا میں بڑھ جاتا ہے۔

سر سسی آبری ملاپ کے لمحات مختصر اور فراق کی داستان بالعموم طویل ہوتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی 'سر سسی آبری' اسی طوالت کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ایک طویل ترین سر ہے اور اس میں کہیں بھی ٹھہراؤ اور سکون نہیں ملتا۔ فراق کے سوز کا یہی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ خوشی ایک عارضی اور ہنگامی جذبہ کی ترجمان ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک قسم کا جمود ہوتا ہے۔ جبکہ فراق، غم دل کے عمل کا دوسرا نام ہے، جو طویل ترین مدت تک جاری رہتا ہے۔

پنوں کے بھائی اسے رات کی تاریکیوں میں اٹھا لے جاتے ہیں۔ صبح دم سسی بیدار ہوتی ہے اور اپنے پہلو میں پنوں کو نہ پاکر بے حال ہو جاتی ہے۔ نالہ و شیون کرتی ہے۔ فراق کی گھڑیاں اسے بیکل کر دیتی ہیں۔ وہ پنوں کی تلاش میں بیابانوں اور صحراؤں میں نکل کھڑی ہوتی ہے۔ سورج کی تپش اس کے جذبہ عشق کے سامنے ہیچ ہے، پانی کا نایاب ہونا، اس کے لیے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا، اس لیے کہ وہ پنوں کی دید سے اپنے دل کی پیاس بجھانا چاہتی ہے۔ سنگلاخ زمین اس کے مہندی لگے پیروں کو لہولہان کر دیتی ہے۔ آبلے دل کے پھپھولے بن جاتے ہیں۔ پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، مگر وہ حوصلہ نہیں ہارتی۔ وہ اپنے جذبہ عشق کی سلامت روی میں آگے ہی بڑھتی چلی جاتی ہے پنوں کی تلاش میں، وصال محبوب کی امید میں۔ بالآخر جستجو کی منزل اسے موت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ وصال یار ہوتا ہے۔ مگر کس صورت میں؟ یہ ساری تفصیل شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر سسی آبری میں بیان کی ہے۔ انہوں نے وصال یار کی منزل کو تصوف کا نکتہ قرار دیا ہے اور نکتہ شناس سسی کو سالک راہ طریقت اور پنوں کو ذات خداوندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

سر معذوری یہ سر بھی سسی کی صحرانوردی کی داستان کا ایک منہ بولتا اظہار ہے۔ اس سر میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سسی کی موت پر یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ موت مصیبت نہیں اور نہ ہی اذیت ناک ہوتی ہے۔ اصل میں یہ ایک واسطہ ہے، جو وصال یار کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ اس سر میں شاہ صاحب نے نفس امارہ کو موذی اور لعین قرار دیتے ہوئے، اسے نیکی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ گردانا ہے۔ شاہ عبداللطیف کہتے ہیں کہ نفس امارہ جستجو کی راہ میں دیوار ہے۔ جس نے اس دیوار کو گرا دیا۔ وہ راہ حق کا سچا سپاہی ثابت ہو گیا۔ نفس کشی کو شاہ صاحب ایک امتحان کہتے ہیں اور سر معذوری میں بتاتے ہیں کہ نفس کشی ایک قسم کا چلہ ہے اور اس چلے کو کاٹنے کے لیے ایک مرشد کامل کی رہنمائی ضروری ہے۔

لغت میں معذور کے معنی 'لاچار' بے بس، مجبور' بے یار و مددگار' عذر کرنے والے یا کمزور کو کہتے ہیں۔ اس سر میں چونکہ شاہ عبداللطیف نے سسی کی بے چارگی، مجبوری اور بے بسی کا ذکر کیا ہے۔ اس معنویت کے سبب یہ سر 'سر معذوری' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر دیسی اس سر میں بھی نفس کشی کا بیان ہے اور یہ سر سسی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ 'دیسی' دیپک راگ کی پانچ بیویوں میں سے ایک ہے اور اسے پرسوز راگنی مانا جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف نے اس سر میں وضاحت فرمائی ہے کہ جو سالک اپنے نفس پہ قابو نہیں پا سکتا، اس کی مثال بے مہار اونٹ کی سی ہے۔ تصوف میں نفس پر قابو نہ پانے والے سالک کے لیے ایسی خوبصورت مثال شاید ہی پہلے کسی نے دی ہو۔ یہ مثال معاشرے اور ماحول کے عین مطابق ہے۔ اونٹ کی نکیل قابو میں نہ ہو، تو خود اونٹ کو بھی اپنے انجام کا پتا نہیں ہوتا۔ یہی صورت نفس کی ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی فرماتے ہیں کہ اس دار المحن میں سالک کو ہمہ وقت بیدار مغز ہونا چاہیے۔

سر کوہیاری یہ سر بھی سر سسی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس سر میں 'جابلوتم' کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اور اس میں بھی نفس کشی کا بیان ہے شاہ عبداللطیف نے اس سر میں بتایا ہے کہ سالک کی کیفیت کبھی ایک جیسی نہیں رہتی۔ وہ اپنے دل سے برائیوں کی بیخ کنی اور نیکیوں کی دنیا آباد کرنے کے لیے ریاضت کرتا ہے اس کے زہد کی منزل میں زیر و بم بھی آتے ہیں اور اسے اپنے قلب کی کشاکش سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے سالک کو از خود اپنی خامیوں کا پتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس دوران وہ انوار الٰہی کی کمی کو محسوس کرتا ہے۔ وہ اندھیرا دیکھ کر دکھی ہوتا ہے اور نور الٰہی کی تابانیوں سے اس کے دل کی روشنی اسے سکون اور خوشیوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نزدیک سالک پر مختلف کیفیات اس وقت تک طاری رہتی ہیں جب تک کہ وہ اپنے نفس کو مار نہیں لیتا۔ جوں ہی وہ اپنی خواہشات کچل دیتا ہے' اسے عرفان مل جاتا ہے۔ سر کوہیاری میں سالک کی ان ہی کیفیات اور خواہشات کا ذکر کیا گیا ہے۔

سر حسینی عربی، فارسی اور اردو میں بے شمار سر ہیں۔ جن میں حسینیت کا ذکر ملتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا یہ سر، سر سسی کے مضمون کے متعلقات میں سے ایک ہے۔ اس میں سسی کی فریاد و آہ و زاری کو طبیب قلب سنایا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے صحراؤں اور بیابانوں میں سسی کی صحرانوردی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ بہت اثر انگیز اور دلدوز ہے۔ اس لیے ان کے اس سر کو 'سر حسینی' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

سر حسینی میں شاہ عبداللطیف نے دنیاوی آلائشوں اور ترک علائق کر کے محبوب حقیقی کی تلاش میں سرگرداں رہنے کا درس دیا ہے۔ دنیا کی بے التفاتی، بے مہری اور اہل زمانہ کی بے اعتنائی کی باتیں پڑھنی ہوں، تو سبھی اس سر میں مل جاتی ہیں۔

سر لیلاں یہ سر سندھی کے قدیم رومان لیلاں چنیسر سے عبارت ہے۔ اس میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھولے بھٹکے لوگوں کو راہ راست دکھائی ہے

اور مایوسی کو کفر اور گناہ سے تعبیر کیا ہے۔ لیلاں ایک ایسی بے چین روح کی داستان ہے جسے اپنے مالک چنیسر کی قربت اور خوشنودی حاصل ہے۔ مگر دنیاوی حرص و طمع کا جال اسے اپنے پھندے میں جکڑ لیتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنے رتبے اور اصل مقام کو کھو دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد اسے جب ٹھوکریں لگتی ہیں، تو وہ آنکھیں کھولتی ہے۔ غفلت اور خوش فہمی کے پردے چاک ہوتے ہیں اور وہ اپنی خطاؤں پر پشیماں ہو جاتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے پرسوز انداز میں سر لیلاں کو اس مضمون کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ اس موقع پر دعاؤں اور التجاؤں کے لیے صرف خدا سے رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں کہ وہی کارساز ہے۔

سر لیلاں میں مقصدیت کا رنگ غالب ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی اس کے ذریعے خدا تعالیٰ کے جابر و قہار اور ستار و غنی ہونے کے بارے میں باور کراتے ہیں۔ حضرت آدمؑ نے دانہ گندم چکھ کر جو غلطی کی اس پر وہ بہت پشیمان ہوئے اور پچھتائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یہی حال لیلاں اور چنیسر کے سر میں ملتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے تبلیغ کے انداز میں فرمایا ہے کہ انسان کو اپنی کسی بات پر کبھی تکبر نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ نخوت و تکبر سب سے بڑی لعنت ہے، ایک قہر ہے، ایک سزا ہے جس سے کوئی بندہ خاکی نہیں بچ سکتا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے اس سر کے منظوم اردو ترجمے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :-

چل ذرا ڈال کے اب اپنے گلے میں پلّو!
ڈھونڈ اس چیز کو جو کھوئی ہے لیلاں تو نے!
شاید اب تجھ سے بنالے تجھے پھر اپنا لے
عذر اس سے جو کیا عاجز و گریاں تو نے!
پھر بھی مقصود مبارک نہ جو دل کا پایا!
در گہ یار سے مجبور و حیران تو نے
یوں ہی فریاد کناں عفو کی طالب رہنا
ہاں جو چھوڑا کہیں امید کا داماں تو نے
ایک لغزش سے گنوایا نہ گنوایا ہوتا!
اپنے محبوب کا الطاف فراواں تو نے
دکھنا فریاد و فغاں اب بھی وظیفہ اپنا
زیست کرنی ہے اگر زود پشیماں تو نے

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اطاعت و عاجزی کو گلے میں پلو کے جو معنی پہناتے ہیں، وہ ان ہی کی سوچ اور فکر کا خاصا ہیں۔ ان کے نزدیک خطاؤں کے بعد جفاؤں میں مصیبتیں جھیلنے سے بہتر ہے کہ انسان فریاد و فغاں کو اپنا وظیفہ بنالے، تاکہ وہ خدا کی رحمت سے اپنی جھولی بھر سکے۔

سُر رانو یہ سر اندیشہ سود و زیاں کی غمازی کرتی ہے۔ اس میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے مومل ایسی غفلت شعار اور تعیش پسند عورت کی فطرت کو واضح کیا ہے، جو کاک محل میں بیٹھ کر عجیب و غریب گل کھلاتی ہے۔ ہزاروں لوگ اس کے مکر و فریب کے طلسمی جال میں پھنستے ہیں اور وہ ہر ایک کو اپنے حسن کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ بالآخر وہ خود ہی اس جال میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ رانو کا جذبہ عشق صادق ہے۔ وہ خلوص نیت کے تحت اسے اپنے دام میں پھانس تو لیتا ہے، مگر اسے مومل کی وفاداری اور سچی محبت کا یقین نہیں آتا۔ مومل، محبت کے جذبے کی صداقت اور عزت کی خاطر اپنی زندگی نچھاور کر دیتی ہے۔ تب رانو بھی اسی آگ میں خاکستر ہو جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس سر میں معرفت کے رنگ میں بہت سے نکات بیان کیے ہیں، جن کا حاصل کلام یہ ہے کہ محبت قربانی مانگتی ہے اور صدقِ عشق کا جذبہ خود کو فنا کر کے ہی ابھرتا ہے۔

سُر سوہنی شاہ عبداللطیف بھٹائی کا بیشتر کلام تمثیلی رنگ میں ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اس دور میں لوک داستانیں بہت مقبول تھیں۔ شاہ صاحب نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے اور انہیں اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے ان ہی کہانیوں کا انتخاب کیا۔ ان کی یہی کہانیاں شاعرانہ موزونیت کے اعتبار سے سر کہلائیں۔

سر سہنی کا اصل کردار سوہنی ہے، جس کے گھر میں 'ڈم' جیسا ظالم شخص موجود ہے۔ وہ اسے مہینوال سے ملنے نہیں دیتا۔ اپنے پرائے سب سوہنی کے دشمن ہیں اور اس دنیا میں وہ اپنے آپ کو یک و تنہا محسوس کرتی ہے۔ مگر مخالفت کی ان آندھیوں میں بھی وہ مہینوال کی محبت کی شمع کو اپنے دل میں فروزاں رکھتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر سہنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محبت ایک ایسی شمع ہے، جو آندھیوں میں بھی جلتی ہے۔ عداوتوں کی ہوائیں، اپنوں کی ستم ظریفیاں اور غیروں کی محاذ آرائیاں بھی اس کی لو کو مدھم نہیں کر سکتیں۔

دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے دلوں کی ان ہی صاف و شفاف راہوں کا ذکر سر سہنی میں کیا ہے۔ سوہنی کا دل، مہینوال سے ملنے کو اچانک بے قرار ہو جاتا ہے۔ وہ کچے گھڑے کو ہی اٹھا کر دریا میں تیرنے لگتی ہے اور طوفانی موجیں اسے نگل لیتی ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ عشق سلامت ہو، تو دلوں کی دوریاں زود یا بدیر ختم ہو جاتی ہیں اور ایثار کا جذبہ تو دونوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپس میں ملا دیتا ہے اور وہ ایسی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں انہیں حیاتِ ابدی نصیب ہو جاتی ہے۔

سُر ماروئی اس سر میں ایک ایسی عورت کے کردار کا پتا چلتا ہے جو پاکدامن و پاک باز ہے۔ ماروی اس کا نام ہے، جو عمر سمرو جیسے جابر حکمران کے چنگل میں پھنس جاتی ہے۔ عمر سمرو اسے طرح طرح کے لالچ دیتا ہے، مگر وہ اس کی طرف مائل بہ کرم نہیں ہوتی۔ وہ اپنی عزت کی خود حفاظت کرتی ہے اور عمر سمرو ایسے جابر اور ظالم حکمران کے اوچھے ہتھکنڈے کو ناکام بنا دیتی ہے۔ وہ اس کی سخت گیری کے باوجود بہ بانگِ دہل کہہ دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت و عفت پر آنچ نہیں آنے دے گی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی "سر ماروئی" میں بتاتے ہیں کہ سچائی اور پاکیزگی کی راہ پر چلنے والے کبھی کسی عمر سمرو کے فریب میں نہیں آسکتے اور ایک جابر اور ظالم حکمران بھی کسی عفت مآب عورت کی عصمت کے آبگینے کو چکنا چور نہیں کر سکتا خواہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو۔ شاہ صاحب نے اس سر میں بھی محبت کی لافانی جذبے کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ امارت کے بل بوتے پر دل نہیں خریدے جا سکتے۔ محبت وہی صادق ہوتی ہے۔ جو طمع کے بغیر اور بے لوث ہو۔ "سر ماروئی" کے منظوم اردو ترجمہ کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے، پھٹی ہے
چھوٹی پونی نہ گز بھر سوت کاتا
کہ آس اپنے عزیزوں سے لگی ہے
جو زحمت ہیں، میں نے پہنے تھے وہ کپڑے
مرے تن کے لئے کافی رہیں گے!

کسی دن بھی نہ بال اپنے سنوارے
پریشان زلف خوشبو کھو چکی ہے !!
کبھی ماروؔ کے گھر بارے کو میں دیکھوں
فقط دل میں یہی حسرت بسی ہے !!
میں پھر صحرا میں اپنے گھر میں پہنچوں
کہ یہ جینا بھی کوئی زندگی ہے !

سر کیڈارو اس سر کو بعض محققین شاہ عبداللطیف ؒ کی سر قرار نہیں دیتے، البتہ جو رسالہ شاہ جو 'کلیان ایڈوانی'، غلام محمد اور محمد ابراہیم شاہوانی نے ترتیب دیے ہیں، ان میں یہ سر شامل ہے 'کیڈارو' میدان جنگ کو کہتے ہیں، جسے بقول چند محققین شاہ صاحب نے 'سر کیڈارو' کا نام دیا، اس سر میں کربلا اور واقعہ کربلا کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس کا ورق ورق، لہو لہو ہے۔ کربلا کا واقعہ انسانیت اور مذاہب عالم کی تاریخ کا بہت بڑا سانحہ ہے، جس سے سچائی اور حق پرستی کی مثالیں روشن ہوتی ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سر کیڈارو میں تلقین کی ہے کہ حق و صداقت کی خاطر جان جانِ آفریں کے سپرد کرنا ہر صاحب ایمان کا فرض ہے۔ نیز ایمان اور حق کے لیے سختیاں جھیلنا، اسوہ حسینی کو زندہ کرنا ہے۔ شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ جھوٹ اور باطل کے سامنے جھکنے سے بہتر ہے کہ انسان حق کی راہ میں جان دے دے۔ یہی اس کی سعادت مندی ہے اور عزت افزائی بھی۔

رنگ و آہنگ کا تجزیہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام جہاں آئینہ معرفت ہے وہاں جہاں نما بھی ہے۔ ان کے ہاں سندھ کے معاشی معاشرتی، ثقافتی جغرافیائی اور تاریخی حالات کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں، ان کے رسالہ شاہ جو کا ہر سر کسی نہ کسی خطے سے متعلق ہے، جس میں نہ صرف اس علاقے کی زبان کا مخصوص لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہے، بلکہ وہاں کے حالات زندگی کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی علاقے کے معاشرے میں رچ بس رہا ہے۔ مثال کے طور پر

- سر سورٹھ میں جوناگڑھ علاقے کا معاشرہ پیش کیا ہے
- سر رانو مول میں سندھ کے اس ریگستانی علاقے کا ذکر ہے، جہاں بر منتخب کرنے کے عجیب طریقے رواج پا چکے ہیں۔
- سر ملوکی میں مال مویشی، بھیڑ بکریاں پالنے والے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور بول چال کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔
- سر سامونڈی میں سمندر کے کنارے بسنے والے کشتی رانوں اور بیوپاریوں کی تہذیب ملتی ہے۔
- سر لیلاں میں عورتوں کی زیورات سے محبت کے جذبے کو پیش کیا گیا ہے۔
- سر دیسی۔ سر معذوری، اور سر کوہیاری میں سسی پنوں کی داستان الفت کے ساتھ ساتھ بھنبور سے قلات تک کے علاقے کے تمدن کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان سروں میں کھو کر پڑھنے والا خود محسوس کرتا ہے کہ وہ افتاں و خیزاں کسی غیر متعین منزل کی جانب بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ باتیں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے سروں میں مقامی حالات کی مظہر نہیں، یہی وجہ ہے کہ سروں نے خواندہ اور ناخواندہ۔ دو طبقوں میں شاہ عبداللطیف کو مقبولیت میں بے پایاں اضافہ کیا ہے۔ موسیقی، شاعری کے فروغ کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ لطائف لطیفی کے مصنف نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنی پوری زندگی میں کوئی ساز نہیں بجایا اور نہ ہی کسی ساز کو ہاتھ لگایا، وہ موسیقی یا رگ دیا کے بڑے جاننے والے تھے، لیکن انہوں نے فقیروں کو اس کی تعلیم نہیں دی۔ راگ سنتے وقت ان پر وجد طاری ہو جاتا تھا کبھی سازوں کے بغیر راگ سنتے تھے اور کبھی طنبورے پر۔

بعض ناقدین شاہ عبداللطیف کی شاعری اور ان کی شخصیت کی مقبولیت کا سہرا ان کی موسیقی کی مہارت کے سر باندھتے ہیں۔ مگر یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اس امر میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ شاہ صاحب کے کلام میں موسیقیت ہے۔ ان کے کلام سے موسیقی کو خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے افکار، ان کی سوجھ اور ان کی علمیت اور فاضلیت کا اعتراف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے بقول "شاہ لطیف نے ایک نیا ساز ایجاد کیا اور راگ کی ادائیگی کا ایک نیا طریقہ پیدا کیا۔ موسیقی میں کلاسیکی راگنیوں اور عوامی نغموں کے ملاپ سے ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی"۔

قصہ مختصر شاہ عبداللطیف بھٹائی نہ صرف دنیا کے عظیم شاعر تھے، بلکہ موسیقی میں بھی ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے سندھی شاعری کو ایک انوکھے انداز سے پیش کیا اور سندھی موسیقی کی بھی وسیع پیمانے پر تجدید کی۔ انہوں نے سندھ کی مروجہ سروں کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ ان کی یہ کاوش رنگ لائی اور وہ صحیح معنوں میں قومی اور عوامی شاعر بن گئے۔

شاہ کی داستانیں

نے پیامی ہے نہ پیغام عزیزاں کوئی
گرد صحرا ہے نہ ابھرے گا شتربان کوئی
میرے اللہ مری حسرت دیدار کو دیکھ
نہ بیج اس دیس میں اس دیس کا مہمان کوئی
دھوؤں ان آنکھوں سے اس کے قدم گرد آلود
جان سکتا ہے مرے عشق کا پایاں کوئی
دور افتادہ ہوں، محبوس ہوں غم دیدہ ہوں
لوگو! اس درد کی تسکین کا ساماں کوئی!

یہ پیار یہ محبت، یہ احساس اور یہ جذبات۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی منظوم سندھی رومانی داستانوں کا ایک حصہ ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں داستانیں سننے اور سنانے کا رواج برسوں سے چلا آ رہا ہے۔ داستانوں کا دراصل اپنا ایک الگ مزاج ہوتا ہے۔ یہ داستانیں شہروں کی بہ نسبت دیہاتوں میں پنپتی ہیں اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ ان داستانوں نے اس وقت جنم لیا، جب مطبوعہ مواد عنقا تھا اور تصوراتی ادب میں ابھی ناول کی ابتدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ درباری اور پیشہ ور داستان گو درباروں اور شاہی ایوانوں میں اور دیہاتی اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر بہادر اور بانکے سجیلے جوانوں وجیہہ اور خوبصورت شہزادوں اور ان کی حسین و دلکش محبوباؤں کے رومانی قصے سنایا کرتے تھے، عرب آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ کر قہوے کی چسکیوں میں محبت، جنگ اور شجاعت کے واقعات گھولتے اور سندھی رات کی تاروں بھری چھاؤں میں حیرت اور تجسس سے ہمہ تن گوش ان رومانی نغموں کو سنتے۔ یہ عہد وسطیٰ تھا۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے اور راتوں کی منزلوں پر الاؤ کے گرد بیٹھ کر اپنے اپنے دیس کی کہانیاں سناتے تھے۔ اس طرح یہ قصے اور کہانیاں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔

یورپ میں رومانوں کا یہ دور دورہ اپنے زمانے کے ساتھ ختم ہو گیا اور طباعت کی سہولتیں اپنے ساتھ رومانوں کی جگہ ناول اور ڈرامے آئیں، مگر مشرق کے سیدھے سادے عوام کے دلوں پر رومانوں کے نقش قائم ہی رہے۔ عرب کی سرزمین سے لیلیٰ مجنوں اور

کلیلہ و دمنہ کے رومان اور ایران کی سرزمین سے شیریں فرہاد اور نوشیرواں کے قصے دہرائے جاتے رہے۔ مرزا صاحباں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کے رومانوں کی صدائے بازگشت پنجاب سے سنی جاتی رہی۔ دیس دیس کی ان رومانی داستانوں کی ترویج میں سندھ کا بھی حصہ تھا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جذبات کی گہرائی اور محبت کی لافانیت کو اپنے تصوفانہ انداز میں بیان کرنے کے لیے ان ہی رومانوں کا انتخاب کیا۔ ان کا رشتہ ساری زندگی عوام سے منسلک رہا۔ اس لیے انہوں نے اپنے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور ماحول سے اپنی داستانوں کا تانا بانا بنا۔

حکیم الامت علامہ اقبالؒ عوامی شاعر تھے اور شاہ عبداللطیفؒ کا شمار بھی عوامی شعراء میں ہوتا ہے، تفاوت یہ ہے کہ اقبالؒ کے عوامی مسائل میں فلسفہ ہے، علم ہے، منطق ہے اور اس رو سے ہر فرد بشر کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ان کے علم اور فلسفے کی گتھیوں کو اپنی عقل سے سلجھا سکے۔ اس کے برعکس شاہ عبداللطیفؒ کے کلام سے ہر کوئی استفادہ کرسکتا ہے ان کے یہاں عوام کے معاملات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ان کی منظوم رومانی داستانوں کا انداز بھی صاف ستھرا، نکھرا اور سچا ہے وہ سہل آسان اور عوامی زبان میں عوام کے مسائل کی بات کرتے ہیں۔ ان کی زبان علمی کم اور سادہ اور عام فہم زیادہ ہوتی ہے۔

ہر ملک کے رومان اور قدیم قصے لوک گیتوں کے ذریعے زندہ رہتے ہیں عوام اور کسانوں کے محبوب گیتوں سے انہیں نئی زندگی ملتی ہے۔ وادی مہران ایک زراعتی علاقہ ہے اور یہاں کے عوام چھوٹے چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں بستے ہیں، نئی تہذیب اور نئے تمدن کے خاکے فقط دھندلے دھندلے ان تک پہنچ پاتے ہیں ان حالات میں سندھ کے دیہات میں رہنے والے اپنی پرانی اور لاعلمی کی دنیا میں پرسکون اور پرمسرت زندگی بسر کرتے ہیں یہ زندہ دل اور پرمسرت لوگ کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں۔ اونٹ اور بھیڑ بکریاں پالتے ہیں اور دن بھر کڑکتی دھوپ اور برستے بادلوں میں سخت محنت کرتے ہیں اور پھر سارے دن کی محنت شاقہ کے بعد قابل رشک سرخوشی کے عالم میں اپنی معصوم تفریحات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ تصنع اور بناوٹ کے عادی نہیں۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں میں بے تکلفی اور سادگی ملتی ہے۔ وہ دیہاتوں کی روایات کا احترام کرتے ہوئے جھوٹ کا اعتراف بھی بڑی بے تکلفی سے کرلیتے ہیں اور صداقت کے اظہار میں بھی کسی نوع کی بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستان، کے مصداق ظاہراً ملاوٹ سے کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے فقدان کے باعث ان سے ایسی خطائیں سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ جو ان کے لیے مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ صالح رہنمائی کے بغیر اپنی زندگی کو خوشگوار اور پرسکون نہیں بنا سکتے۔ مقدرت کا فیصلہ یہی تھا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اس رہنمائی کا فرض ادا کریں اور عوام کی داستانوں ہی کو ذریعہ اظہار بنا کر ان کی فوز و فلاح اور بہبود و اصلاح کی راہیں ڈھونڈ نکالیں۔

عوامی مسائل کو داستانوں کی صورت میں ڈھالنا، ہر کسی کے دائرہ اختیار میں نہیں، ایک ذی شعور احساس اور چابکدست فنکار ہی اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ گو اس کی راہ میں پگ پگ پہ دشواریاں جنم لیتی ہیں، پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتا، بلکہ صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے حالات کا مشاہدہ کرتا ہے اور تب عوامی زبان کی سادگی اور اذہان کی فہم و بصیرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں اپنے شیریں اور دھیمے انداز میں داستانوں کا حصہ بنا دیتا ہے سندھ کی تہذیب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاہ صاحب کی جدتِ طبع کے سوا اور کسی سے ممکن نہ تھا۔ عبدالواحد سندھی لکھتے ہیں ؛۔

"شاہ صاحب کی شاعری کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ دہقان سے لے کر عالم تک ان کے کلام سے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کسی نہ کسی طرح لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ دونوں کے دلوں پر ان کے کلام کا اثر نہایت گہرا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع وادیٔ سندھ کی قدیم مروجہ رنگینیوں اور اس خطے کی داستانوں کو بنایا ہے، جن کا یہاں کے عوام میں پہلے ہی رواج تھا، جیسے عمر ماروی، سسی پنوں اور لیلا چنیسر وغیرہ۔ لیکن انہوں نے ان داستانوں کو اس طرح پیش کیا کہ فنی اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی داستانوں کے موضوعات وہی منتخب کیے جو عوام کی زبانوں پہ تھے اور جن کا وادی مہران کے ذرے ذرے سے ہر نوع کا ربط و ضبط تھا، لیکن شاہ صاحب نے ان داستانوں میں سچائی کے جو رنگ بھرے وہ منفرد اور شوخ و شنگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی منظوم داستانیں مشعل ہدایت بن گئیں اسی قبیل کی عشقیہ داستانوں کا سراغ اردو، فارسی، پشتو، بلوچی اور پنجابی زبانوں اور بولیوں میں بھی ملتا ہے، مگر ان سب داستانوں میں شاعری زیادہ اور حقیقت کم ہے۔ بقول اختر انصاری اکبر آبادی :۔

"یہ داستانیں جاگیردارانہ دور کی پیداوار ہیں۔ رئیس زادے جہاں عیاشی کے دوسرے اہتمام کرتے تھے، وہاں ایک اہتمام یہ بھی تھا کہ قصہ گو اس خدمت کے لیے مامور کیے جاتے تھے کہ سوتے وقت تخیل اور سلانے والی داستانیں سنائیں تاکہ جاگنے والے میٹھی نیند سو جائیں وادی سندھ کی داستانیں بھی جاگیردارانہ دور ہی کی پیداوار ہیں مگر ایک نازک سا فرق ہے اور وہ یہ کہ سندھ کی داستانیں شہزادوں اور رئیس زادوں کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف خالص غریب کی داستانیں ہیں اور ان میں کسی بھی خوابیدگی کو کوئی دخل نہیں۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی لکھی ہوئی داستانیں حادثات کی پیداوار نہیں ہیں۔ ان میں سکون کم اور بے قراری زیادہ ہے۔ اسی بیقراری کے عالم میں شاہ صاحب نے عوام کو ہر وقت بیدار اور ہوشیار رہنے کا درس دیا ہے اور یہ مبنی بر صداقت ہے۔ عشق واقعی ایک خلش ہے کہ جس سے راتوں کی نیند اور ان کا چین لٹ جاتا ہے عشق ایک تپش ہے، ایک آتش ہے کہ جس کا مداوا سکون نہیں، بیقراری ہے۔ تذکرہ نویسوں کی رائے میں شاہ صاحب ان ہی داستانوں سے جانے اور پہچانے گئے اور یہی داستانیں ان کی حیات کی عظمت کا نشان بن گئیں۔ ان کا بیشتر کلام تصوف کے نکات، رومانی راز و رموز اور قریب قریب سندھ کی مشہور عشقیہ داستانوں پر مبنی ہے۔ صبیحہ حسن لکھتی ہیں کہ سسی اور پنوں کی طرح سندھ کے رومان اور قصے اس برعظیم کے گوشے گوشے میں مشہور ہیں۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے، لافانی عبداللطیف نے انہیں اس قوم کے لیے ایک قیمتی خزانے میں تبدیل کر دیا ہے اور کسی نہ کسی حصے میں ہر رومان شاہ صاحب کے تصوفانہ رنگ اور عشق حقیقی کے اظہار کا آلۂ کار بنا ہے۔ حقیقت میں شاہ صاحب کے رسالے میں سندھ کے تمام رومانوں کے علاوہ پنجابی رومان مثلاً ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال بھی شامل ہیں۔ سندھ کے چھ رومان بے حد مشہور اور دل پسند ہیں اور شاہ کے رسالے میں ہر ایک کا کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ہے۔ ان میں ہر ایک کا موضوع محبت ہے اور رومان میں محبت کی لامحدود مسرت اور اس کے سسکتے ہوئے درد کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا۔ رومان تقریباً ہمیشہ نظم کی شکل میں ہوتے ہیں۔ مگر ہمیشہ شاہ عبداللطیف سا شاعر نہیں ملتا اور نظم کی خوبصورتی کے علاوہ انسانی جذبات سے ہم آہنگی رومانوں کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کو وطن کی سرزمین سے والہانہ عشق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

داستانوں میں مقامی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ سب داستانیں مسرّوں کی صورت میں ہیں اور ان میں قصّے کہانیوں والی فرسودگی اور مبالغہ آرائی یا تعلّی دکھائی نہیں دیتی۔ ان عرض میں واقعات کا تسلسل ہے انسانوں کا حسن ہے اور ڈرامائی کیفیت سے یہ داستانیں مملو ہیں۔ شاہ صاحب نے ان داستانوں کے موضوعات سندھ کی حکایت خیز سرزمین ہی سے حاصل کیے اور بعض قدیم مروجہ قصوں کو افکارِ جدید سے صیقل کیا۔ شاہ صاحب کی لکھی ہوئی چند مشہور داستانیں ملاحظہ ہوں۔

عمر ماروی

سندھ میں عمر ماروی کا قصہ بے حد مشہور ہے۔ یہ صرف محبت کا افسانہ نہیں، ملیر گاؤں کے ایک غریب چرواہے کی حسین لڑکی کی کہانی ہے جسے عمر کوٹ کا حاکم عمر سمرد اغوا کر کے لے گیا۔ ماروی کی منگنی اپنے ہی خاندان کے ایک لڑکے سے طے پا چکی تھی۔ وہ بے حد حسین تھی اور یہی حسن اس کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ سمرد نے ماروی کو ایک دو منزلہ مکان میں قید کر دیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ اس سے شادی کرے۔ ماروی وفا شعار تھی۔ وہ عمر کی محبت میں ثابت قدم رہی اور اس نے سمرد پر واضح کر دیا کہ اگر اس نے زبردستی شادی کرنے کی کوشش کی تو وہ خودکشی کرے گی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر اس کے عزیزوں نے اس کو آزاد کرا لیا تو ٹھیک، ورنہ ماروی عمر سمرد سے شادی کر لے گی۔ اس عرصہ کے دوران ماروی بالاخانہ میں محبوس رہی۔ اس کے ہونٹوں پر ہجر و فراق کے گیت تھے ؎

یہی اک دعا ہے خداوند سے
وہ قدرت سے اپنی یہ ساماں کرے
عزیزوں سے اپنے میں جا کے ملوں
شب و روز بیٹھی میں سوچا کروں
جو لکھا گیا پھر نہ بدلا گیا
قلم ہو گیا خشک تقدیر کا

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی منظوم سندھی داستان عمر ماروی کا 'سورلے' نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا اور پھر اسے اردو کے قالب میں خوش فکر شاعر ابن انشاء نے ڈھالا۔ شاہ صاحب کی یہ داستان ایک پری پیکر کا امتحان ہے، جو انسانی فرعونیت کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ سندھ کے اس مقبول رومان کا زمانہ عربوں کی صوبیداری ختم ہونے کے فوراً بعد کا ہے۔ جب سندھ میں سمرد قبیلہ برسرِ اقتدار آیا۔ مارد قبیلے کا نام بھی ہے اور ماروی کے محبوب کا نام بھی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جس دلنشیں اور خوبصورت انداز میں اس رومان کو نظم کیا ہے وہ ان ہی کا خاصہ ہے۔ ملاحظہ ہو اس رومان کے اردو ترجمے کے چند اقتباسات :-

جو کانوں میں میرے یہ لفظیں پڑیں
بتا میں بھلا تیرا مالک نہیں "
مرے دل نے چپکے سے "ہاں" کہہ دیا
کہ کچھ اور کہنا تو ممکن نہ تھا
مرے لوگ مجھ سے بہت دور تھے
مرے پاس آنے سے معذور تھے
مرا قید ہونا ہی تقدیر تھی !
یہ پتھر پہ قدرت کی تحریر تھی

کہ اپناؤں گھر بار کو چھوڑ کر ؟
یہ زنداں، یہ زنداں کے دیوار و در
جو چرواہے سے اپنے میں دور ہوں
تو اس حال کو زندگی کیوں کہوں !

ترا دشمن ہوئی کلک تقدیر سے
کہ مارو تو کانٹے چنیں دشت کے
ادھر میں الگ اس طرح سے جیوں
کہ ان بالاخانوں میں بیٹھی رہوں،
عزیزوں سے دوری وطن کا یہ تیاگ
لگا دوں نہ ان اونچے محلوں میں آگ
ہر ایک شے کہیں بھی ہو کیسی بھی ہو
پلٹتی ہے اپنی قدیم اصل کو

شاہ عبداللطیف ماروی کے دکھ درد کی شدت کا احساس رکھتے ہیں اور ہجر و فراق میں اسے تسلیاں دیتے ہیں اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

لے تو دیس نئے آیا کوئی ڈاچی والا
اپنے محبوب کو یادوں سے فراموش نہ کر
ایسی پاگل تو نہ ہو لوٹ کے آئے گا یہاں
ایک پل کے لیے قلعہ میں ٹھہر اور ٹھہر
ایک ہی پل کے لیے قلعہ میں رہنا ہے تجھے
دیکھنا تجھ سے نہ مل پائے پرانی چھوٹے

بالآخر ماروی عمر کو فریب دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اپنے محبوب کے پاس پہنچ کر اسے قربت مل جاتی ہے اور اس حیات نو پہ مسکراتی ہے اور خدا کا شکر ادا کرتی ہے ؎

من میرے کا مالک ٹھرو	مارو کا من میرا
کیوں اپنا منہ دھوؤں میں ہمرد	مالک مرا کہے گا
اجنبیوں میں گئی تھی تو کیا	منہ دھونے خوش ہونے
لے میں چلی اب پیا کے ڈیرے	چھوڑ کے لٹنے دھونے

شاہ صاحب نے اس رومانی داستان میں بتایا ہے کہ محبت کی دلکشی اور اس کا حسن خواہ کتنا ہی سرور آمیز کیوں نہ ہو، مگر احساس کی بیداری، رنگینی کے باوصف نیکی کی راہ استوار کر دیتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے عمر ماروی کی داستان میں جو موتی پروئے ہیں، ان کی چمک دمک سے سندھی معاشرے کے کئی نقوش تازہ ہیں۔

سسئی پنوں

اس داستانِ عشق و محبت سے کون واقف نہیں، سندھ ہی نہیں، بیرونِ سندھ بھی اس لوک رومان کے چرچے ہیں، یہ داستان اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب ۱۲ء میں سندھ میں نیا نیا اسلام طلوع ہوا تھا۔ سندھی ادب کے علاوہ یہ داستان فارسی، بلوچی اور پنجابی ادب میں بھی موجود ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زبانی یہ داستان کچھ یوں ہے کہ راجہ دولا رائے کے عہد میں ٹھٹھہ کے ایک برہمن کے ہاں ایک حسین لڑکی جنم لیتی ہے۔ نجومی اس کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہ لڑکی کسی مسلمان سے شادی کرے گی۔ ان پر یہ بات بجلی بن کر گرتی ہے۔ ...

بچی کو ایک لکڑی کے صندوق میں بند کرکے دریائے سندھ کی خطرناک موجوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ صندوق ایک ایسے مسلمان کے ہاتھ لگتا ہے، جو اولاد سے محروم ہے۔ اس لڑکی کا نام سسّی رکھا جاتا ہے۔ سن شعور تک پہنچتے پہنچتے سسّی حسن بے نظیر کی مالک بن جاتی ہے کیچ کا بلوچ شہزادہ پنوں سسّی کے علاقے میں آتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر دل و جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ پنوں اپنے بوڑھے باپ آری جام کی مرضی کے خلاف سسّی سے شادی کر لیتا ہے۔ آری جام کو پتا چلتا ہے۔ تو وہ اپنے چھ جوان بیٹوں کو بھنبور بھیجتا ہے، تاکہ وہ پنوں کو واپس لے آئیں۔ پنوں کے بھائی اسے نشہ آور شے کھلا کر ایک تیز رفتار سانڈنی پر سوار کر لیتے ہیں اور کیچ کی طرف بھاگ نکلتے ہیں۔ سسّی صبح کے وقت بیدار ہوتی ہے اور اپنے پہلو میں پنوں کو نہ پا کر تڑپ تڑپ اٹھتی ہے وہ پنوں پنوں پکارتی ہوئی صحراؤں میں نکل آتی ہے۔ شاہ عبداللطیف نے پنوں کی جدائی سسّی کے فراق کا نقشہ بڑے درد انگیز انداز میں کھینچا ہے۔

"بے سہارا، بے آس
کمزور اور کسی رہبر کے بغیر
میں اپنے محبوب کے لیے خون کے آنسو روتی ہوں
میری محبت آنسو بہا رہی ہے
میرا دل ویران ہے
اور پنوں نہ جانے کہاں ہے"۔

صحرا نوردی کے دوران تھک ہار کر سسّی ایک جگہ بیٹھ جاتی ہے۔ اسے ایک گڈریا ملتا ہے۔ جو اس کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو کر اس سے اظہار عشق کرنے لگتا ہے۔ شاہ صاحب سسّی کے پاکیزہ کردار کا نقشہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

"صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے
غم کے بوجھ تلے
فراق میں چور چور سسّی روئی
دعا مانگی
اے خدا یہ زمین پھٹ جائے
اور میں اس میں سما جاؤں"۔

کہتے ہیں کہ گڈریے نے سسّی کی عزت کو داغدار کرنا چاہا تو اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جس کے بعد زمین شق ہوئی اور سسّی اس میں سما گئی۔ ادھر پنوں ہوش میں آنے کے بعد اپنے بھائیوں کی قید سے نکل بھاگتا ہے اور سسّی کی تلاش میں اسی جگہ آ جاتا ہے۔ اسے جب حقیقت حال کا علم ہوتا ہے تو وہ دعا مانگتا ہے کہ اسے اس کی سسّی سے ملا دیا جائے۔ خدا انسانوں سے زیادہ سنگدل نہیں ہوتا۔ سسّی کی قبر پھٹتی ہے اور سسّی کی بانہیں پنوں کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہیں۔

لیلاں چنیسر سندھ کا یہ رومان اس اعتبار سے سب سے زیادہ دلچسپی کا حامل ہے کہ اس میں عوامی جذبات، انسانی کمزوریوں اور خطاؤں کی عکاسی کی گئی ہے اس داستان میں تخیلاتی دنیا کے اونچے آئیڈیل نہیں ملتے' بلکہ یہ محبت کی ازلی اور ابدی تکون کی کہانی ہے۔ دو عورتیں اور ایک مرد۔ یہی تین کردار اس داستان کی روح رواں ہیں۔ دیول کوٹ کا حاکم چنیسر اپنی وجاہت اور دلیری کے لیے مشہور ہے۔ اس کی فقط ایک ہی کمزوری ہے کہ وہ اپنی بیوی لیلاں کی ساحرانہ اور دلفریب اداؤں کے آگے بالکل بے بس ہے۔

شاہ عبداللطیف کے بیان کے مطابق یہ خوبصورت جوڑا محبت کے نشہ میں سرشار مسرت انگیز زندگی بسر کر رہا تھا کہ کونرو نامی ایک ہندو راجہ کی خوبصورت اور ضدی لڑکی ان کے درمیان حائل ہو گئی۔ وہ اپنی ہٹ دھرمی کے زعم میں عہد کر چکی ہے کہ چنیسر کا دل جیت کر رہے گی۔ چنانچہ کونرو ایک ملازمہ کے بھیس میں لیلاں کے پاس پہنچتی ہے۔ وہ اپنے ہمراہ ایک نولکھا ہار بھی لے جاتی ہے اور اس ہار کے عوض لیلاں سے اجازت طلب کرتی ہے کہ اسے چنیسر کے ساتھ ایک رات بسر کرنے دی جائے۔ زیورات عورت کی کمزوری ہوتے ہیں وہ سوچتی ہے کہ ایک رات کی بات ہی کیا ہے چنیسر تو اس کا ہی رہے گا۔ شاہ صاحب کے خیال میں اس نے اپنے محبوب پر بہت زیادہ بھروسہ کر لیا تھا۔ وہ پل بھر کے لیے یہ بھول گئی تھی کہ چنیسر آخر کو مرد ہے۔ ادھر کونرو ایک رات میں لیلاں کی محبت کا تختہ الٹ دیتی ہے۔ وہ چنیسر سے کہتی ہے کہ لیلاں کے پاس جو ہار ہے، وہ کسی غیر مرد کا تحفہ ہے۔ چنیسر یہ سن کر انتقام میں آ جاتا ہے اور لیلاں کو اس کے گاؤں بھیج کر کونرو کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ لیلاں اور چنیسر کی نظمیں شاہ کے رسالے میں نامرادی اور پچھتاوے کے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ منظوم اس طرح ہے۔ ؎

<u>لیلاں</u>

تو نے کیوں محو کیا ہے انہیں لوح دل سے
حاصل زیست سمجھتے ہیں جو پیارے تجھ کو
اے مرے دسرو کنور میرے چنیسر راجہ
دل مرا آج بھی رو رو کے پکارے تجھ کو
ان کے زخموں پہ مدھر بولوں کا مرہم رکھنا
اب بھی اپنا جو سمجھتے ہیں پیارے تجھ کو
ان کو خلقت کی نگاہوں میں نہ رسوا کرنا
واسطہ دیتی ہوں جینے کے سہارے تجھ کو
تیری سورامیاں تو میرا اکیلا پیتم
دل بسارے تو بھلا کیسے بسارے تجھ کو

<u>شاعر</u>

ایک ادنیٰ سا گلوبند تھا جس کی خاطر
کھو دیا دل کے خداوند کو ناداں تو نے
تجھ سے برگشتہ ہوا تیرا چنیسر راجہ
کپٹی کونرو سے کیا ایک جو پیماں تو نے
چل گیا ادنیٰ سے زیور کی ڈنک کا جادو
جانے کیا سمجھا تھا چاہت کو مری جاں تو نے

<u>لیلاں</u>

میں یہ سمجھی تھی کہ یہ ہار مرصع رتنا
ہاتھ آئے تو مرا روپ سوایا ہو گا!!
یہ نہ سمجھی تھی کہ یہ ہار ہے ظالم بیری
کپٹی کونرو نے کوئی جال بچھایا ہو گا

<u>شاعر</u>

چل ذرا ڈال کے اب اپنے گلے میں پلّو
ڈھونڈ اس چیز کو جو کھوئی ہے لیلاں تو نے

شاید اب تجھ سے بسنا لے تجھے پھر اپنا لے
عذر اس سے جو کیا حاجت دگر یاں تونے

لیلاں

آج میں در پہ تیرے آئی ہوں دسرو پیارے
اپنا اک عمر کا سرمایہ عصیاں لے کر
تو جو آزردہ ہے کیوں آؤں میں در پہ تیرے
دل آشفتہ و مجبور و پریشاں لے کر یار

یہ داستان مخصوص المیہ انجام پر ختم ہوتی ہے۔ چنیسر کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور لیلاں چنیسر کے بازوؤں میں اس احساس کے ساتھ کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتا ہے، خوشی کی زیادتی سے دم توڑ دیتی ہے۔

لیلاں چنیسر کی داستان کو پڑھ کر شاہ عبداللطیف کی فکری عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ اس داستان میں اپنے مسلک اور درس کا اعادہ کرتے ہیں اور خدا پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ہمت کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ :

" اگر التجاؤں سے بھی خدا کا قرب حاصل نہ ہو سکے۔ تو مایوس نہ ہو۔ اس لیے کہ یاسیت گناہ ہے۔ التجا و آہ وزاری جاری رکھ۔ امید کا دامن نہ چھوڑ کیونکہ خدا غفور الرحیم ہے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کو اللہ تعالیٰ نے حکیمانہ دماغ ودیعت کیا تھا۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ اس لیے انہوں نے لیلاں چنیسر کی داستان میں انسان کو زندگی کی صالح آسودگی کے لیے جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی۔

مومل رانو

اس داستان کا تمام تر ماحول مشرقیت کا ضامن ہے۔ یہ داستان مومل جیسی خوبصورت اور ہوشیار ہیروئن بہادر اور بے پروا رانو اور حاسد عاشق کے ساتھ تفصیلات میں قرون وسطیٰ کے یورپین رومانوں سے بہت مشابہ ہے۔ رانو، ایک راجپوت راجہ تھا اور مومل پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں میرپور ماتھیلو کے ایک حکمران راجہ نند کی نو بیٹیوں میں سے سب سے زیادہ حسین اور خوبصورت تھی۔ مومل نے بھول بھلیاں تیار کرائیں، جن کا سارا ماحول طلسماتی تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ جو کوئی ان بھول بھلیوں میں آکر مجھے ڈھونڈ لے، میں اسی کے ساتھ شادی کروں گی۔ رانو اس میں کامیاب ہو گیا، مگر بعد ازاں اس نے شاہ ہونے کی بنا پر اپنی محبوبہ مومل کو چھوڑ دیا۔ اس جدائی میں مومل کے جذبات کیا تھے؟ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بڑے درد انگیز انداز میں اس کی تصویر کشی کی ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو :-

کھینچ رہی ہے پریت پیا کی کوئی نہ مجھ کو روکے
اپنے ہی من کو سمجھائے اپنے آپ کو ٹوکے
کوئی نہ مجھ کو روکے
چڑھی ہوئی یہ چنچل ندیا، اور یہ آدھی رات
پریتم ہے اس پار میں کیسے پکڑوں اس کا ہاتھ
یہ لہروں کے جھونکے
کوئی نہ مجھ کو روکے
پریت کی اگنی سلگی ہے دھواں سا ہے اس پار
میرے من میں آگ لگی ہے لے چل اے منجدھار
کیوں مجھے کوئی روکے
کوئی نہ مجھ کو روکے

پیار میں بدگمانی بھی بہت جلد ہو جاتی ہے۔ یہی بدگمانی مومل اور رانو کے درمیان حائل ہو گئی اور اس نے ان دونوں کو فراق کے عمیق سمندر میں دھکیل دیا۔ دراصل مومل کی بہن سومل ایک روز اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ رانو نے مردانہ لباس میں لیٹی ہوئی سومل کو غیر مرد سمجھ لیا اور دل برداشتہ ہو کر چلا گیا۔ واپسی سے قبل اس نے اپنی نشانی بھی مومل کے سرہانے چھوڑ دی۔ وہ صبح بیدار ہوئی اور رانو کے چلے جانے پر بہت پچھتائی۔ اس نے رانو کو منانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ رانو تو ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ چکا تھا۔ مجبور ہو کر مومل نے بنجارے کا بھیس بدلا اور رانو کے محل کے سامنے ایک جھونپڑی بنا کر رہنے لگی۔ اس پر بھی جب رانو مائل بہ کرم نہ ہوا، تو مومل نے آگ کا الاؤ تیار کرایا اور اپنی جان پر کھیل گئی۔ رانو کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے بھی اپنے آپ کو اسی آگ کے سپرد کر دیا۔

مومل اور رانو، دونوں عمر بھر عشق کی آگ میں جلتے رہے۔ بالآخر اسی آگ نے انہیں جلا کر راکھ کر دیا۔ گویا دونوں کی منزل ایک ہی تھی۔ اس آتش عشق سے کون واقف نہیں؟ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی اس کی حدت کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کے جذبات کا ترجمہ جمیل نقوی کی زبانی یہ ہے :-

بے چینی سے لوٹ رہے ہیں
عشق کی آگ میں جلنے والے — لب پہ مسلسل آہیں نالے
روئیں روئیں میں آگ لگی ہے — رگ رگ جل کر راکھ ہوئی ہے
رگ رگ میں ہے کرب جلن کا — ایک ہی عالم ہے تن من کا
دیکھ اگر ہے تاب نظارا — آتش عشق کا کھولتا دھارا
دہکے جو لوں کے انگارے

سوہنی مہینوال

شاہ عبداللطیف کی ایک داستان "سوہنی مہینوال" بھی ہے۔ یہ داستان رسالہ شاہ جو میں ملتی ہے اور پنجاب کی داستانوں میں بھی اس کا شمار ہوتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس داستان کو اس اعتبار سے سندھ کی قدیم داستانوں میں شامل کیا ہے کہ سوہنی اور مہینوال کی نعشیں دریائے چناب میں تیرتی ہوئی شہداد پور سے جا کر برآمد ہوئیں، جو کہ سندھ کا علاقہ ہے۔ یہ داستان شاہ عبداللطیف کے ہاں سر سوہنی کی صورت میں نظم ہے اور دلیسی داستان عشق ہے کہ انسانی فہم و فراست کو بھی حیران کر دیتی ہے۔ شاہ کے ہاں اس عشق کا جذبہ اور ولولہ انوکھا اور نرالا ہے۔ شیخ ایاز نے سر سوہنی کا ترجمہ کیا ہے۔ اس سے شاہ صاحب کی جزئیات نگاری کے گہرے مشاہدے کا پتا چلتا ہے۔ اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

سوہنی کیا ہے اور کیا مہینوال
راز سربستہ ہی رہی یہ بات
فہم و ادراک کی رسائی کیا
عشق ہے ماورائے امکانات

یہ داستان گجرات شہر سے شروع ہوتی ہے اور سلاطین مغلیہ کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مشہور کمہار "تلا" رہتا تھا، جس کے بنائے ہوئے برتنوں کا بڑا شہرہ تھا۔ سوہنی اس کی اکلوتی بیٹی تھی، جو ان برتنوں پر نفیس و پرکار نقش و نگار بناتی تھی۔ اتفاق سے ایک روز بلخ بخارا کا تاجر مرزا عالی گجرات آیا اور

ٹلے کی دکان پر برتن خریدنے کے بہانے آکر سوہنی پر فریفتہ ہوگیا۔ دونوں میں محبت ہوگئی مرزا عالی کچھ مدت تک برتن خرید کر بیچتا رہا، مگر اسے یہ تجارت راس نہ آئی۔ جو راس المال تھا وہ ختم ہوگیا اور انجام کار اس نے سوہنی کے کہنے پر ان کی دکان پر ملازمت کر لی۔ تلے نے گھر کے کام کاج بھی اس سے لینے شروع کر دیے۔ یوں مرزا عالی مہینوال مشہور ہوگیا۔

عشق مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مہینوال پیار کی چوری کے الزام میں نکالا گیا۔ اس نے دریائے چناب کے کنارے ایک جھونپڑی بنالی اور تلے نے سوہنی کی شادی کسی اور جگہ کر دی۔ مگر وہ برابر دریا کے اس پار سے گھڑے پر تیر کر مہینوال کو ملنے کے لیے آتی رہی۔ ایک دن اس کی نند نے اسے دیکھ لیا اور سارا معاملہ سمجھ گئی۔ اس نے پکے گھڑے کی جگہ کچا گھڑا رکھ دیا۔ سوہنی عشق میں ثابت قدم رہی۔ اس نے کچا گھڑا ہی اٹھایا اور دریا میں تیرنے لگی۔ تھوڑی دور چل کر کچا گھڑا ساتھ نہ دے سکا اور سوہنی دریا کی لہروں کی نذر ہوگئی۔ مہینوال دور کنارے پر کھڑا یہ دلدوز نظارے دیکھ رہا تھا اس نے بھی سوہنی کی چیخ و پکار سن کر دریا میں چھلانگ لگا دی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی سوہنی سے مل گیا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے :-

اردو ترجمہ :- گھڑا کچا، میں تنہا اور چھائے

برستی رات کے گھنگھور سائے

فضا ایسی کہ جیسے شیر کوئی

کہیں بیٹھا ہو اپنا سر اٹھائے

سہارا دے مجھے اے جوش الفت

کمی تیری تمنا میں نہ آئے

نڈر ہو کے میں اب دریا میں کودوں

بلا سے جان جاتی ہے تو جائے

اس داستان کا ترجمہ کرتے ہوئے شیخ ایاز نے یہ اشعار بھی منظوم کیے ہیں :

بجز دلبر ہی یہ کچھ نہیں موقوف ۔ ساری دنیا ہے حسن سے معمور

کارفرما ہے اے مرے محبوب ۔ فرش سے تا بہ عرش تیرا نور

خیر ہو دار و گیر کی یارب

ذرہ ذرہ ہے پیروِ منصور

شاہ عبداللطیف کے نزدیک سوہنی کا کردار عظمت کا نشان ہے۔ خیر ہو دار و گیر کی یارب! اور ذرہ ذرہ ہے پیروِ منصور، کہہ کر انہوں نے مکارمِ فلسفہ کو اجاگر کیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی دلبستے اور ایک مخصوص انداز کے ساتھ محبوب مجازی سے گزر کر محبوب حقیقی سے ہم کلام ہیں۔ شاہ صاحب کی اس داستان میں سُر سوہنی کے علاوہ کئی راگ وابستہ ہیں، مگر ان راگوں کی تبدیلی سے داستان کی روانگی، بے ساختگی اور حقیقت نگاری پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سوہنی مہینوال سریری راگ کا ترجمہ کچھ یوں ہے

سے شباہت زرد پھولوں کی طرح دہکتی آگ پہ منڈلا رہے ہیں

صلائے عام یہ نظارگی ہے پتنگے راستے دکھلا رہے ہیں

تنگی تشنگی بجھاتی ہے!

تشنگی تشنگی بڑھاتی ہے

اور پھر تشنگی محبت کی

غیر محدود ہوتی جاتی ہے

نوری جام تماچی

اس داستان حسن و عشق کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے جس خوبصورت پیرائے میں نظم کیا ہے وہ ان ہی کا خاصا ہے۔ یہ داستان انسان کے ظاہر و باطن کی کہانیوں کو دہراتی ہے۔ شاہ صاحب کے نظریے کے مطابق جن لوگوں کا ظاہر و باطن ایک ہو، وہی اس دنیا میں اور آنے والی دنیا میں سرخرو ہوتے ہیں۔ نوری جام تماچی کی داستان کچھ اس طرح ہے کہ کسی زمانے میں کینجھر جھیل کے کنارے مچھیروں کی ایک بستی تھی۔ مشہور حاکم جام تماچی کا دور تھا مچھیرے بدحال و بے سلیقہ تھے۔ ان کے پاس رہنے کو گھر اور پہننے کو کپڑے نہ تھے مچھیرنیں گلی گلی ہوکا لگا کر مچھلی فروخت کرتی تھیں۔ ان ہی میں ایک مچھیرن "نوری" تھی جس کی تیکھی نظروں نے جھیل کے کنارے سیر کرتے ہوئے جام تماچی کے دل کو زخمی کر دیا۔ جام تماچی نے نوری سے شادی کر لی۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے خیال میں محبت کا یہ انمٹ جذبہ تھا جس نے غربت اور امارت کی سب دیواروں کو زمین بوس کر کے رکھ دیا۔ نوری اپنی قسمت پہ نازاں تھی اور جام تماچی سے کہہ رہی تھی :

میں ایک غریب مچھیرن

میرے محبوب، میری سرکار

کہیں آپ مجھے چھوڑ تو نہ جائیں گے ؟

میں اک غریب مچھیرن

مجھے یہ اعزاز ملا ہے کہ میں ملکہ بن گئی ہوں

میرے محبوب میری سرکار

میری زندہ محبت

آپ کو سلام کہتی ہے۔

اور میری آنکھیں آپ کے اس احسان کے بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہیں گی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ نے نوری کی زبان میں محبت کے ان جذبات کی جو عکاسی کی ہے وہ نوری ایسی غریب لڑکی کے احساسات کی ایک کہانی ہے۔ نوری کا کردار ان کے نزدیک دانشمندانہ اور سادگی کا ایک انمول تحفہ ہے۔ جام تماچی اس موقع پر نوری کی سچائی اور نیازمندی کو پرکھنا چاہتا ہے۔ وہ محل میں کہلا بھیجتا ہے کہ آج تمام رانیاں کیل کانٹے سے درست ہو جائیں۔ جس کی زیبائش زیادہ دلنشیں ہوگی۔ اسے اپنے دامن میں جگہ دے کر شاہی سواری کی سیر کراؤں گا۔ سب رانیاں سولہ سنگار میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ مگر نوری حسن و سادگی کی تصویر بنے ایک کونے میں کھڑی رہتی ہے۔ جام تماچی آتا ہے۔ زرق برق لباس میں ملبوس رانیوں کے مقابلے میں سادہ لباس میں بھولی بھالی نوری کو دیکھ کر اس پہ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ نوری پھر کہہ اٹھتی ہے۔

میں ایک غریب مچھیرن

میرے محبوب میری سرکار

جام تماچی نوری کو گلے سے لگا کر ساتھ لے جاتا ہے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ ظاہری حسن و زیبائش کوئی معنی نہیں رکھتی۔ محبت کا جذبہ لافانی ہے۔ اسے کوئی بھی دھن دولت اور جبر سے نہیں خرید سکتا۔

سور تھ رائے ڈیاچ

رائے ڈیاچ جونا گڑھ کا راجہ تھا۔ اس کی فقط ایک بہن تھی اور وہ بھی اولاد کی نعمت سے محروم۔ ایک دن اس نے ایک فقیر سے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا اس نے دعا دی اور کہا کہ تیرے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا جو رائے ڈیاچ کا سر قلم کر دے گا۔ یہ سن کر راجکماری گھبرا گئی اور اس نے ایک سال بعد جنم لینے والے لڑکے کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا کی لہروں کی نذر کر دیا۔

اسی زمانے میں راجہ انی رائے کا ایک پڑوسی حکمران تھا۔ اس کے علاقے میں ایک ڈُومنی اور اس کا خاوند پانی بھرنے کے لیے دریا کے کنارے آئے۔ ان کی نظر اس صندوق پر پڑی انہوں نے صندوق کھولا تو نوزائیدہ خوبصورت بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ بچہ اس قدر پیلا تھا کہ وہ اسے گھر لے گئے۔ اس کا نام بیجل رکھا اور اس کی پرورش کی۔ بیجل نے جوان ہو کر گانا بجانا شروع کر دیا۔

دوسری طرف انی رائے کے ہاں بھی اسی روز لڑکی پیدا ہوئی جس روز بیجل نے جنم لیا تھا۔ انی رائے کی پہلے ہی سات لڑکیاں تھیں اس نے آٹھویں لڑکی کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا۔ یہ صندوق رائے ڈیاچ کی سرحد پہ ایک کمہار کے ہاتھ لگا۔ اس نے لڑکی کو بڑے ناز و نعم سے پالا اور اس کا نام سورٹھ رکھا۔ رتن رائے کمہار رائے ڈیاچ کی رعایا اور راجہ انی رائے کے خادموں میں سے تھا۔ سورٹھ جوان ہوئی، تو اس کے پری جمال حسن کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ راجہ انی رائے نے رتن رائے کو بلایا اور اس سے سورٹھ کا رشتہ مانگا۔ وہ رضامند ہو گیا اور شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ ادھر یہ خبر رائے ڈیاچ کے کانوں میں پڑی، تو وہ رتن رائے پر بہت برہم ہوا۔ اس نے سورٹھ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ راجہ انی کو معلوم ہوا، تو وہ برافروختہ ہوا اور رائے ڈیاچ کے ساتھ اس نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جونا گڑھ کے محاذ پر دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور راجہ انی ناکام ہو کر وطن لوٹ آیا۔ اس نے اعلان کیا کہ جو کوئی رائے ڈیاچ کا سر کاٹ کر لائے گا، اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ بیجل کی بیوی نے جب یہ سنا تو اپنے شوہر کو یہ مہم سر کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ بیجل رائے ڈیاچ کے محل پہنچا اور اس سے سر طلب کیا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس داستان کو بڑے دردناک انداز میں پیش کیا ہے سورٹھ اور رائے ڈیاچ کی یہ داستان کا ماحصل راجہ رائے ڈیاچ کی وعدہ وفائی کے سوا کچھ نہیں۔ رائے ڈیاچ اور بیجل میں گفتگو ہوتی ہے۔

رائے ڈیاچ :- مانگو جو کچھ مانگتے ہو۔

بیجل :- اگر تم دھن کے پکے، قول کے سچے ہو تو اپنا وعدہ پورا کرو۔

رائے ڈیاچ :- کون سا وعدہ ؟
کیا وعدہ ؟
مجھے تو کچھ یاد نہیں

بیجل :- اپنا سر دان کرو
فقیر نے جو کچھ کہا تھا، سچ ہے۔

رائے ڈیاچ :- مجھ سے زر و جواہر مانگ لے۔
میرا سر لے کر تمھیں چند ہڈیوں کے سوا کیا ملے گا۔

بیجل :- میں بھکاری نہیں
لالچی نہیں
مجھے صرف تمہاری قربانی کی ضرورت ہے۔
لاؤ۔ لاؤ۔ اپنا سر لاؤ
اپنا سر دان کرو۔
میں یہاں کھڑا ہوں۔

بیجل کی اس خواہش پر محل میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور رائے ڈیاچ کی بہن اور ماں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ رائے ڈیاچ قول کا سچا اور دھن کا پکا تھا۔ اس نے اپنی بات رکھی اور بیجل کو اس کا سر مل گیا وہ بہت خوش تھا۔ سر لے کر سیدھا راجہ انی رائے کے پاس پہنچا۔ راجہ انی رائے غصے سے بلبلا اٹھا اور بیجل سے کہنے لگا "اے کمبخت جب تو اتنے سخی اور منصف مزاج راجہ کا سر لا سکتا ہے تو وقت آنے پر تو میرے ساتھ بھی اچھا سلوک نہ کرے گا۔ تو ظالم ہے لالچی ہے تجھے اس ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔"

راجہ انی رائے کے یہ الفاظ سن کر بیجل بیکل ہو گیا، بیوی کا قول اس کے لیے آزار بن گیا تھا وہ پاگلوں کی طرح سر لے کر جونا گڑھ کی طرف لپکا، دوڑا۔ مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سارے شہر کو آگ لگی ہوئی ہے۔ رائے ڈیاچ کی بیوی ستی ہونے والی تھی اور بیجل نے اسی آگ میں کود کر اپنی جان دے دی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کہتے ہیں کہ آدمی جب بے راہرو ہو جاتا ہے تو قدرت اسے کسی نہ کسی طرح سے سزا دے دیتی ہے۔ لالچ انسان کو اندھا کر دیتا ہے۔ اس داستان میں شاہ صاحب نے جو نتیجہ پیدا کیا ہے وہ بے انتہا پر اثر اور مفید ہے۔ شاہ صاحب نے اس داستان کو منفرد اور انوکھے انداز میں رقم کیا ہے یہ داستان آج بھی سندھ میں مقبول ہے اور اس کی مقبولیت کا سہرا شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے سر ہے۔ اختر انصاری اکبر آبادی رقمطراز ہیں :-

"شاہ کی داستانیں نہ کہانیاں ہیں اور نہ ڈرامہ، ان میں فارسی زدہ انداز فکر ہے اور نہ ہی مغربی شاعری کا کوئی اثر ہے۔ بغرض یہ کہ کسی مروجہ انداز کی تقلید کہیں نہیں ملتی۔ بلکہ اپنے فطری ذوق کو رہنما بنا کر اپنی علیحدہ راہیں وضع کی ہیں۔ سسئی ہو یا مومل ماروی کا بیان ہو یا لیلاں کی اپنی داستان، سب کے دل کا سوز نرالا ہے۔ شاہ کا طبعی میلان ہر کردار میں جان ڈال دیتا ہے۔ شاہ کا کلام سندھی زبان میں پڑھیے یا اردو میں نثر کے مطالعہ کیجیے، کلام کی دلگرفتگی سوز اور حلاوت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ الفاظ بانگ درا اور ضرب کلیم بن کر دل میں اترتے جائیں گے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی داستانیں، صرف ادبی خزانے کی حیثیت نہیں رکھتیں، بلکہ یہ زبان زد خاص و عام ہو چکی ہیں ان داستانوں کا نظم و نثر میں کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو رہا ہے انگریزی میں تو بہت سی داستانوں کا منظوم ترجمہ ہو چکا ہے۔ سندھ میں ہر جگہ دریا کے کناروں پر درویشوں کے مزاروں پر تھر کے صحراؤں اور ٹھٹھہ کے قدیم باغات میں لوگ ان داستانوں کو سنتے ہیں اور ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ان داستانوں میں ثابت کیا ہے کہ رومان صرف تصوراتی اور تخیلاتی نہیں ہوتے، بلکہ ان میں حقیقت کا عنصر بھی بہت حد تک غالب ہوتا ہے۔ سندھ کی ہر داستان ایک خاص عہد سے متعلق ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ ان داستانوں کے کردار جیتے جاگتے انسان تھے، جو محبت کے لیے زندہ رہنا اور محبت کی خاطر مر مٹنا جانتے تھے۔ وہ محبت کی سچی عظمت اور رفعت سے آشنا تھے۔ اس وصف نے انھیں قصص کے کردار اور اولیا و مسلک بنا دیا اور ان کی محبت کو لافانیت بخش دی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی داستانیں بادی النظر میں وادی مہران کی قدیم روایات اور سماجی حالات کی مظہر ہیں۔ یہ داستانیں انہوں نے اپنے مخصوص انداز بیان سے تراشی ہیں۔ گو ان داستانوں میں سے چند کا مواد قدیم داستانوں سے مستعار لیا گیا ہے، تاہم مفاہیم کے اعتبار سے یہ توصیف کے قابل ہیں جیسا کہ شیخ ایاز نے بھی لکھا ہے :-

"شاہ نے اپنے کلام میں سندھ کے جن سماجی عوامل کی عکاسی کی ہے۔ ان کے لیے انھیں زیادہ تر اپنے مشاہدات پر بھروسہ کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کچھ مواد سابق داستانوں اور دیگر ثقافتی روایات سے بھی حاصل کیا، ساتھ ہی مذہبی نقطۂ نظر سے ہندو اور مسلمان کے عقائد اور فرائض کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک ایسے مسلک کو عوام الناس میں پھیلانے کی والہانہ کوشش کی، جو اعلیٰ اخلاقی اقدار کا

سرچشمہ ہو اور پوری انسان ذات کی محبت و اخوت کا مبلغ ہو۔"

زندگی کو بالفرض ایک افسانہ تصور کر لیا جائے تو اس دنیا کی حیثیت ایک داستان کی سی قرار دی جائے گی اس طرح ہر داستان کی تہہ میں سیکڑوں افسانے مستور ہیں، جہاں تک شاہ عبداللطیف بھٹائی کی داستانوں کے تجربے کا تعلق ہے، تو یہ حقیقت تسلیم کر لی پڑتی ہے کہ ان کی نوشتہ داستانوں میں بھی کئی افسانے پوشیدہ ہیں۔ یہ افسانے بیش بہا صداقتوں اور علامتوں کے مظہر ہیں اور ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ہر افسانے یا داستان میں کردار عورت کے عورت میں اجاگر ہوتے ہیں اور عورت ہی کے توسل سے اخلاقی نکات اور مردوں کی نفسیات کے مظاہر سامنے آتے ہیں۔ ان داستانوں میں کوئی کردار ایسا نہیں ملتا، جو مقصد سے مبرا ہو۔ ہر کردار اور داستان سبق آموز ہے اور ان سے نیکی اور خدا پرستی کی تلقین ملتی ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہر داستان میں انسانوں کو صراطِ مستقیم پہ چلنے کا درس دیتے ہیں اور انہیں خدا کی خدائی اور وحدانیت کا والہ و شیدائی بنا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ابراہیم خلیل نے بھی اس طرح اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام داستانوں میں یہی ہے کہ انسان جب خود کو خدا کی تلاش میں فنا کر دیتا ہے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے یعنی خدا کو پا لیتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی داستانیں بادشاہوں، شہزادوں، جنوں اور پریوں کے مافوق الفطرت کرداروں کے گرد نہیں گھومتیں اور نہ ہی ان میں سرمایہ داروں اور سرمایہ پرستوں کے قصے ملتے ہیں، بلکہ یہ داستانیں عام لوگوں کی زندگی، پریشانیوں، الجھنوں اور امیدوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں، جو عرب و عجم کی دیگر داستانوں کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہوئیں۔ سرشار عقیلی کے بقول:۔

"شاہ صاحب سے پہلے لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے افسانوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ شاہ صاحب نے خاص دیسی افسانوں کو ان کی جگہ پیش کیا، کیونکہ یہ تفصیلی طور پر ملک کے عوام میں مشہور ہونے کے ساتھ ساتھ ملکی ماحول سے بھی زیادہ مطابقت رکھتے تھے۔ ایک لحاظ سے یہ سندھ کی اس قدیم تاریخ کے جز تھے، جو بے احتیاطی کی بنا پر بھلائے جا چکے تھے۔ ان افسانوں میں سندھ کی قدیم تہذیب کے خد و خال سمائے ہوئے تھے، جن کو شاہ صاحب خود منصۂ شہود پہ لائے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی نوشتہ داستانوں میں محبت و انسانیت، اخوت و مروت، عقیدت و انسیت اور انوار و تجلیات کے تمام مدارج پائے جاتے ہیں۔ یہ داستانیں بنی نوع انسان کو خدائی پہچان اور قربت کے جذبے سے معمور کر دیتی ہیں۔ آنجہانی ڈاکٹر گربخشانی ہندو ہونے کے باوجود اپنے ایمان افروز خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس بارے میں لکھتے ہیں کہ ان قصوں اور کہانیوں کو خالی داستانیں اور لوک کہانیاں نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان میں بڑی بڑی تمثیلیں سمائی ہوئی ہیں، جن میں اسرارِ الٰہی پنہاں ہیں۔ ان سے روحِ حق کو تابندگی و درخشندگی ملتی ہے۔ اور انسان کا دل اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتا ہے۔ ایسے ہی کئی اقتباسات شاہ عبداللطیف بھٹائی کی داستانوں کا تجزیہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان داستانوں میں جزئیات نگاری کے گہرے مشاہدات ملتے ہیں اور تشبیہات و استعارات بھی۔ کوئی بھی داستان خواہ طویل ہو یا مختصر، شاہ صاحب نے اس میں ابہام پیدا نہیں ہونے دیا، بلکہ انہیں صاف ستھرے اور پاکیزہ انداز میں پیش کیا ہے۔

معاصرین

کان میں بانگِ الست کی پڑی جس دم صدا
قلب نے صدق و صفا سے کہہ دیا قالو بلیٰ

اور یارانِ وطن سے باکمال ذوق و شوق
میں نے فوراً عہد و پیمانِ محبت کر لیا

عشقِ ازلی کا ذکر، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے جس پر اثر انداز میں کیا ہے وہ تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ صوفیانہ شاعری خواہ کسی بھی علاقائی زبان میں ہو، وہ روحانیات کی حامل ہوتی ہے۔ مذکورہ قطعہ، شاہ عبداللطیف کے کلام کا ہی منظوم ترجمہ ہے جس میں انہوں نے معرفت کے رنگ میں بنی نوع انسان کی پوری تاریخ کو سمو دیا ہے۔ ہمارے قدیم صوفی شعراء کی یہی خوبی تھی کہ وہ سلوک اور تصوف کے نکات کو ایمان افروز پیرایوں سے بیان کرتے تھے، تا کہ عوام چند روزہ حیات کی وقعت سے آگاہ ہو سکیں۔ اور زندگی کے ایک وسیع تر اور جامع تر نظریے کو سمجھ سکیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ذہن میں نہ صرف انسانوں کے ایک مثالی معاشرہ کا مکمل اور واضح تصور موجود تھا، بلکہ وہ اپنے دور کے حالات سے بھی اچھی طرح باخبر تھے۔ جس زمانے میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں ہر طرف طوائف الملوکی اور افراتفری پھیل چکی تھی۔ شاہ عبداللطیف کی شاعری کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اسی زمانے میں پنجاب کے مشہور شاعر حضرت سلطان باہو اور حضرت بابا بلھے شاہ اور پشتو کے مشہور شاعر رحمان بابا بقید حیات تھے۔ ان کی شہرت بیانی کا ہر سو چرچا تھا۔ مختلف علاقوں میں بسنے والے یہ صوفی شعراء مختلف زبانیں بولنے کے باوجود ایک ہی چشمہ سے سرشار تھے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، رحمان باباؒ، حضرت بابا بلھے شاہؒ اور حضرت سلطان باہوؒ کے خیالات میں کس قدر ہم آہنگی پائی جاتی تھی! اس کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اسلامی ادب اور ثقافت جامع چیز ہے جس کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے۔ یک رنگی کے باوجود اس میں تنوع اور تنوع کے ساتھ ساتھ یگانگت پائی جاتی ہے۔ ان سب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ چاروں صوفی شعراء کی منزل ایک تھی یہ منزل عشقِ حقیقی کی منزل تھی، جس پر جادہ پیما ہو کر، شاہ عبداللطیفؒ، رحمان باباؒ، حضرت بابا بلھے شاہؒ اور حضرت سلطان باہوؒ نے مسلمانوں کو ان کی عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا۔ ان کے اذہان کو بیدار کیا اور ان کے قلوب میں ایک نئی روح پھونکی۔ انہوں نے اپنے کلام کو عوام کی تطہیرِ نفس، ذہنی بیداری، تبلیغِ مساوات، تقدسِ افکار اور روحانی بیداری کا ذریعہ بنایا۔

یہ بات، انوکھی سہی، مگر تاریخی حقیقت کی غماز ہے کہ برکوچک پاک و ہند میں مغلیہ شہنشاہی کی عظمت و جبروت کے آخری مظہر، محمد محی الدین، اورنگ زیب عالمگیر کی موت اگر ایک طرف اس اعتبار سے تاریخ میں یادگار حادثے کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے بعد مغلیہ اور چغتائی سلطنت کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے بکھر گیا تو دوسری طرف اس کا یہ پہلو بھی کچھ کم اہم نہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی رحلت کے بعد پاکستان اور بھارت کے مختلف علاقوں میں احیائے مذہب، احیائے ادب اور احیائے فکر کی نئی نئی تحریکیں اٹھیں اور کابل سے جنوبی ہند میں ملیبار تک پھیلی ہوئی مغلیہ سلطنت کے ہر گوشے میں مصلحین، مفکرین اور صوفی شاعر وجود میں آئے۔ جنھوں نے وقت کی رفتار اور رفتارِ تمدن پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی گرفت کمزور ہو جانے کے سبب سلطنتِ مغلیہ کے زیرِ اقتدار علاقوں کو زیادہ عمل آزادی نصیب ہوئی جس کا نتیجہ عام علاقائی بیداری کی شکل میں رونما ہوا۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال و انتشار کے زمانے ہی میں وہ علاقائی اور قومی ادب پیدا ہوا، جس پر آج ہم ناز کرتے ہیں۔ مثلاً سندھی ادب، پشتو ادب، پنجابی ادب کی ترقی و تجدید کا زمانہ ٹھیک یہی ہے۔ جب برکوچک میں سیاسی شکست و ریخت کا عمل بڑی قوت کے ساتھ جاری تھا اور شاہ عبداللطیفؒ، رحمان باباؒ، حضرت بابا

بلھے شاہؒ اور حضرت سلطان باہوؒ کے ہاں فکر کی صدہا مشابہتیں اور مناسبتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ چاروں شعراء ہمعصر ہونے کے علاوہ افکار کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب تھے۔

رحمان بابا

پشتو ادب میں عبدالرحمان باباکی ذات کسی حاشیہ آرائی کی محتاج نہیں جنھوں نے جس انس و محبت اور اخوت و مروت کا پیغام دیا، اس کی افادیت وسعت اور عالمگیر اہمیت مسلم ہے اگرچہ اردوداں طبقہ ان کے حالات اور کلام کی باریکیوں اور گہرائیوں سے ناآشنا ہے۔ تاہم زبان، رنگ اور لباس کے اختلاف کے باوجود ان کے خیالات سے بہت مانوس ہیں۔ آپ عبدالستار خاں کے ہاں ۱۰۴۲ھ میں پیدا ہوئے جو پٹھانوں کے ایک بڑے اور مشہور قبیلہ مہمند سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا بیشتر حصہ افغانستان اور سرحد کے اس طرف پاکستان کے قبائلی علاقہ میں آباد ہے اور کچھ حصہ پشاور اور کوہاٹ کی سڑک کے قریب جوار میں صدیوں سے آباد چلا آرہا ہے۔ رحمان بابا پشاور سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر اسی علاقہ کے ایک گاؤں دیہہ بہادر میں پیدا ہوئے۔ یوسفزئی قبیلہ کے مشہور عالم حضرت محمد یوسف سے فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی اور کوہاٹ میں بھی کچھ عرصہ تعلیم میں مشغول رہے۔ پاکستان اور بھارت کے بیشتر علاقوں کی سیر و سیاحت بھی کی اور جوانی ہی میں فقیری اور درویشی اختیار کر کے پشاور کے قریبی گاؤں "ہزار خوانی" میں رہنے لگے تھے۔

حضرت رحمان بابا "امی محض" اور ناخواندہ قسم کے درویش نہ تھے۔ آپ کے متعلق جو پرانی تصنیفات ملتی ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ ایک بلند پایہ عالم و عابد انسان تھے حصول علم اور درویشی کی راہ میں آپ کو بھی ویسے ہی مراحل سے گزرنا پڑا، جو دنیا کے بڑے بڑے صوفیوں کو پیش آئے۔ حضرت امام غزالیؒ، مولانا رومؒ اور ایسے بہت سے صوفیائے کرام ابتدا میں عالم ہی تھے۔ لیکن جوں جوں ان کے علم میں اضافہ ہوتا گیا۔ اتنا ہی انھیں اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا احساس ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ رحمان بابا خود فرماتے ہیں ؎

خان هر کوره نا آگاه راحسته کندیږی
له هغه ورځې را هسې چې آگاه یم

(ترجمہ) جس دن سے میں آگاہ ہوا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ آگاہ نہیں ہوں اردو کے ایک شاعر کی زبان میں یوں کہیے کہ ؏

جو پایا جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

آپ کے سن وصال کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، تاہم اکثریت ۱۱۱۹ھ پر متفق ہے۔ بعض مؤرخوں کے خیال میں آپ نے شاہ جہاں، اورنگ زیب عالمگیر اور شاہ عالم، تینوں بادشاہوں کا دور دیکھا ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں آپ کمسن تھے اور آپ کی شاعری اس وقت اوج کمال پر پہنچی جب مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور صدیوں سے قائم شدہ ایک مستحکم و مضبوط حکومت کی بنیادیں لرز گئی تھیں۔ اورنگ زیب پر بھی آپ نے کئی اشعار کہے۔

رحمان بابا کو صرف شاعر عشق و محبت ہی نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کا مبلغ اور مصلح اخلاق بھی مانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا کلام نہ صرف پٹھانوں کی عام مجالس اور حجروں میں بہت ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے، بلکہ تبلیغی اجتماعات، مساجد اور مدارس میں نہایت انہماک اور دلچسپی سے سنا جاتا ہے آپ عام فہم دلکش، شیریں، سادہ اور رواں زبان میں اپنے پاکیزہ خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی پشتو شاعری سراسر آمد ہے اور دل کی واردات کی صحیح عکاسی کرتی ہے اور حقیقت و مجاز کے مختلف پہلوؤں کی ترجمان بھی ہے اتنہ لوگ اپنی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے ان کے دیوان سے فال نکالتے ہیں۔

بلھے شاہ

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دوسرے معاصر حضرت بابا بلھے شاہؒ ہیں آپ کا اصل نام عبداللہ تھا۔ ۱۱۰۳ھ بمطابق ۱۶۸۰ء میں سخی محمد درویش کے ہاں تولد ہوئے، جو موضع پانڈو تحصیل قصور ضلع لاہور میں سکونت پذیر تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بلھے شاہ اوچ گیلانیاں میں پیدا ہوئے اور ابھی ان کی عمر چھ ماہ تھی کہ والدین موضع پانڈو میں ہجرت کر آئے۔

موضع پانڈو میں حضرت بابا بلھے شاہ کے والد درس و تدریس کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ انھوں نے بیٹے کو مویشی چرانے کا کام سپرد کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بلھے شاہ مویشی چرانے باہر گئے آپ مویشیوں کو کھلا چھوڑ کر خود ایک درخت کے سایہ میں سو گئے، مویشیوں نے ایک زمیندار جیون خان کے کھیت کا ستیاناس کر دیا۔ زمیندار نے جب اپنے کھیت کو ویران حالت میں دیکھا تو مویشیوں کو مار مار کر بھگا دیا۔ کچھ دور جا کر اسے بلھے شاہ ایک درخت کے نیچے میٹھی نیند کے مزے لوٹتے ہوئے نظر آئے اور ایک چھنیر سانپ ان پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ زمیندار کا بیان ہے کہ چھنیر سانپ مجھے دیکھتے ہی بھاگ لیا۔ میں نے بلھے شاہ کو بیدار کیا اور ان سے کھیت کے اجڑنے کا شکوہ کیا مگر وہ بولے کہ کھیت تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے جیون خان نے دوبارہ کھیت کی طرف دیکھا تو اسے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئی۔ کھیت واقعی سرسبز و شاداب تھا۔ وہ اس پر بہت متاثر ہوا اور اسی وقت بلھے شاہ کا عقیدت مند بن گیا۔ اس نے اپنا کھیت ان ہی کی نذر کر دیا۔

بابا بلھے شاہ نے ابتدائی تعلیم قصور کے مولوی غلام مرتضیٰ سے حاصل کی ان دنوں ان پر مجذوبیت کا عالم طاری تھا۔ ایک بار آپ عالم بے خودی میں پھرتے پھراتے گورداسپور کے شہر بٹالہ جا پہنچے۔ جوانی کی عمر میں مجذوب ہو کر منصور کی طرح انا الحق کہہ بیٹھے تب یہ لوگ آپ کو پکڑ کر شیخ فاضل الدین کی خدمت میں لے گئے شیخ فاضل الدین نے ایک ہی نظر میں ان کے دل کی کیفیت کو پرکھ لیا اور انھیں شاہ عنایت قادریؒ کی خدمت میں بھیج دیا شاہ عنایت قادری کی محبت کا آپ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ آپ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کے مرید ہو گیے۔ شاہ عنایت قادری قصور کے رہنے والے درویش تھے ایک دفعہ حاکم قصور حسین خان نے انھیں کلمہ حق کہنے کی پاداش میں شہر بدر کر دیا اور آپ قصور چھوڑ کر لاہور آبسے۔ بلھے شاہ جب پہلی بار ان سے ملے تو کہا کہ مجھے خدا کی راہ بتائیے عنایت شاہؒ قادری نے فرمایا ؎

دیکھ بلھیا رب دا کی پاؤناں
ایدھروں پٹنا، اودھر لاوناں

ترجمہ: اے بلھے شاہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر دھیان رکھو۔
ایک طرف سے پودے کو اکھاڑا جائے اور دوسری طرف لگایا جائے

مرشد کی یہ بات سن کر آپ پر کچھ عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور آپ نے برملا کہہ دیا ؎

بلھے شاہ دی سنو حکایت ـــــ ہادی پکڑیا ہوئی ہدایت
میرا مرشد شاہ عنایت ـــــ اوہو لنگھاوے پار

ترجمہ: بلھے شاہ کی کہانی سنو جس نے اپنے مرشد شاہ عنایت طرف سے ہدایت پائی ہے، وہی اس کی کشتی کو پار لگائے گا۔

شاہ عنایت قادری نے ۱۱۴۱ھ کو اس جہان رنگ و بو کو خیرباد کہا۔ ان کی رحلت کے بعد بلھے شاہ ان کی گدی پر بیٹھے اور کافی عرصہ تک لوگوں کو بادۂ تصوف سے سرشار کرتے رہے۔ آپ کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ بتائی جاتی ہے۔ خزینۃ الاولیاء میں یہ قطعہ درج ہے ؎

چو بلھے شاہ شیخ ھمہ در عالم
مقام خویش اندر خلد در زید
رستم کن شیخ اکرام ار تلاش
دگر ھادی اکبر مست توحید

۱۱۷۱ھ

آپ کا مزار قصور ریلوے سٹیشن سے مشرق کی جانب تقریباً دو فرلانگ کی مسافت پر زیارت گاہ انام ہے۔

بابا بلھے شاہ ایک عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ کا کلام عشق حقیقی اور علم و عرفان کا خزینہ ہے۔ اس کلام کو ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو مولوی انوار علی نے پہلی بار مرتب کر کے "قانونِ عشق" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد یہ کلام کئی بار چھپ چکا ہے۔

سلطان باہوؒ

آپ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے تیسرے ہمعصر ہیں۔ رحمان بابا کی طرح آپ کی بھی کوئی قطعی اور مستند تاریخ پیدائش و وفات معلوم نہیں۔ مولا بخش کشتہ "پنجابی شاعراں دا تذکرہ" میں لکھتے ہیں کہ آپ ۱۰۲۹ھ مطابق ۱۶۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۱۰۲ھ مطابق ۱۶۹۰ء میں رحلت فرمائی۔ بعد کی روایات کے مطابق آپ ۱۶۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۷۲ء میں انتقال کر گئے۔ آپ کے والد عربی النسل تھے اور آپ کے آباؤ اجداد حضرت امام حسینؓ کی شہادت عظمیٰ کے بعد نامساعد حالات کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے۔ انہوں نے شور کوٹ کے گاؤں میں قیام کیا اور تبلیغ حق میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں یہ علاقہ کفر و شرک کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد کے بہت سے بزرگوں نے یہاں اسلام پھیلایا اور تاریکیوں میں نور کے اجالے بکھیرے۔

حضرت سلطان باہو کے والد ایک سادہ اور معمولی حیثیت کے انسان تھے اور ساری زندگی حالات کی نامساعدت کا شکار رہے، مگر انہوں نے یادِ الٰہی سے منہ نہ موڑا، تکالیف برداشت کیں اور ہر دم اللہ ھو کا ورد کرتے رہے۔ یہی وظیفہ ان کے بیٹے سلطان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا جو بعد از آں سلطان باہو کہلائے۔ آپ کے متعلق کئی تذکروں میں آپ کی روحانی عظمتوں کے متعلق روایات اور حکایات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی کے یہ عظیم ترین صوفی شاعر بچپن ہی میں صاحب کرامت تھے۔ ایک بار ایک ہندو آپ کے والد سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے جب حضرت باہو کو والد مکرم کی گود میں بیٹھا دیکھا تو ان کے چہرے سے نور برس رہا تھا اس نے نور کا ہالہ دیکھ کر وہیں کلمہ پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

حضرت سلطان باہو، جب قدرے جوان ہوئے تو والد ماجد نے آپ کو کھیتی باڑی کے کام کی طرف مائل کرنا چاہا۔ مگر آپ نہ مانے اور زمینداری کا کام کاج چھوڑ کر ملتان چلے گئے۔ اولیائے کرام کے اس شہر میں آپ نے حضرت بہاؤالحق ملتانی کے مزار پر چلہ کشی کی۔ یہاں سے امرتسر پہنچے اور شاہ حبیبؒ کی صحبت اختیار کر لی۔ انہوں نے آپ کو دہلی جانے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت سلطان باہو دہلی تشریف لے گئے اور حضرت عبدالرحمان کے مرید ہو گئے جو اپنے وقت کے اولیائے کرام میں سے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے تصوف کے موضوع پر ایک سو چالیس کتابیں لکھیں ان کتابوں میں شمس العارفین، مفتاح العارفین، محکم الفقرا، امیر الکونین اور دیوان باہو، بہت مشہور ہیں۔ آپ نے سادہ مگر زوردار الفاظ میں نفس کشی کی تلقین کی۔ روحانی کرشموں کے علاوہ آپ کی شاعرانہ صلاحیتوں نے پنجابی ادب کے دامن کو ہیرے موتیوں سے بھر دیا۔ دیگر صوفی شعراء کی طرح آپ نے اخلاق اور تصوف کے مسائل و معاملات کو پیچیدہ بنانے کی بجائے انتہائی سادہ اور مؤثر الفاظ میں بیان کیا۔ ان کے یہ انداز فکر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بہت زیادہ قریب تھا۔ آپ کا مزار ضلع جھنگ کی تحصیل شور کوٹ میں ہے، جہاں ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

کلام کا موازنہ

رحمان بابا، بلھے شاہ اور حضرت سلطان باہو، شاہ عبداللطیف بھٹائی کے معاصرین ہونے کے اعتبار سے خواہ پہلے پیدا ہوئے ہوں یا بعد میں فوت ہوئے ہوں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا جہاں تک ان صوفی شعرائے کے کلام کا تعلق ہے اس کا منبع ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ الٰہی سے بے پناہ عشق۔ چاروں کے کلام میں توحید و رسالتؐ کے رموز پائے جاتے ہیں، شاہ عبداللطیف بھٹائی اس کے آغاز میں فرماتے ہیں۔

سندھی:-

وحدہٗ لاشریک لہٗ، جڏھن چوجن
تن مڃيو محمد کارڻ حبيبان سان ڏھين
تڏھن منجھان تن، او تڙ کو نہ اديسو

وحدہٗ لاشریک لہٗ، پڌرو نہ پوڻ اِ
ک تو کنھن نہ سُا، جي گھٽ اندر گھوريا،
گاٽ نبيدي گوڻ ھا، جت شاھد تبندڙ ساموڻ

اردو:-

وحدہ لاشریک لہ، جس نے کیا اظہار
اس کو مقام محمدی کی، منزل نہیں دشوار
سر کی نذر گزار، جھکا نہ آگے غیر کے

وحدہ لاشریک لہ، انس و جن کا کلام
دل ہے مقام محمدی، فاصلہ یک گام
ساحل ہے الزام، دل دریا میں ڈوب جا

رحمان باباؒ بھی اسی تصور کے قائل ہیں۔ ان کے دل میں بھی توحید و رسالت کا وہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے، جو شاہ عبداللطیف بھٹائی میں ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

پشتو:-

گورہ مسے کردگار دے رب زما
چہ صاحب دکل اختیار دے رب زما
لمحی بزرگاران چہ څوک بیئے دائی
ترھر د بزرگار دے رب زما
نڈیئے ھیخ حاجت پہ چا باندے مرقوف دے
نہ د ھیچا منت بار دے رب زما
لہ نیستئ یئے ھستئ صورت پیداکرد
مسے رنگ پروردگار دے رب زما
ھم صانع دے کہ جملہ مصنوعات تو
ھم سامع دھر گفتار دے رب زما

ترجمہ:- دیکھو ہے کردگار میرا رب
صاحب اختیار میرا رب
نام سنتے ہیں جن بزرگوں کا
سب سے والا تبار میرا رب

کس پہ موقوف اس کی حاجت ہے
کس کا منت گزار میرا رب!
نیستی سے ہے صورت ہستی
کر رہا آشکار میرا رب
صانع خلق سننے والا ہے
ہر بشر کی پکار میرا رب

پنجاب کے صوفی شاعر بابا بلھے شاہؒ نے اس مضمون کو اس انداز میں باندھا ہے کہ وہ بھی شاہ عبداللطیف اور رحمان بابا کے ہم خیال ہو گئے ہیں۔

پنجابی:۔ میں ہوری کھیلوں گی کہہ کر بسم اللہ
نام نبی کی رتن چڑھی بوند پڑی اللہ اللہ
رنگ رنگیلی اوہی کھلاوے جو سکھی ہوئے فنا
"الست بربکم" پیتم بولے سب سکھیاں گھونگھٹ کھولے
"قالوا بلیٰ" کہہ کر بولے لا الٰہ الا اللہ!!
"نحن اقرب" کی بنسی بجائی من عرف نفسہ کی کوک سنائی
فثم وجہ اللہ کی دھوم مچائی وچ دربار رسول اللہ
ہاتھ جوڑ کر پاؤں پڑوں گی عاجز ہو کر دستی کروں گی
جھگڑا کر بھر جھولی لوں گی نور محمد صل علیٰ

(ترجمہ) میں بسم اللہ پڑھ کر ہولی کھیلوں گی۔
پیتم نے کہا "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟
یہ سن کر تمام سکھیوں (مخلوق) نے پردہ ہٹا دیا اور کہا
"ہاں" تو ہمارا رب ہے اور سب نے پکارا "لا الٰہ الا اللہ"
میں ہاتھ جوڑ کر پاؤں پڑونگی (آداب بجا لاؤں گی)
اور عاجزی سے التجا کروں گی
میں لڑ جھگڑ کر بھی محمدؐ کے نور سے جھولی بھر لوں گی

شاہ عبداللطیف، رحمان بابا اور بلھے شاہ کے کلام کے مطالعہ سے ایک قاری بآسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ توحید و رسالت سے ان کی عقیدت کوئی رسمی یا صرف دکھاوے کی نہ تھی، بلکہ عشق الٰہی کے رنگ میں وہ ایسے رنگے ہوئے تھے کہ اس کے بغیر اور کسی چیز سے بھی محبت نہ صرف حرام و ناجائز بلکہ دل کی بیماری سمجھتے تھے آج سلوک و تصوف کی راہ میں ان کے مشاہدات اور تجربات عوام کو ایک نئی دنیا میں لے جاتے ہیں، جہاں سکون، طمانیت، محبت اور یگانگت ہے۔ ایک ہی راستہ، ایک ہی نصب العین اور ایک ہی منزل مقصود۔ اگر ان کے کلام سے سندھی، پشتو اور پنجابی زبان کا لباس ہٹا دیا جائے تو بمشکل کوئی بین فرق نظر آئے گا۔ اور یہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ کون سے اشعار کس کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان شاعروں کے احساسات و جذبات میں بے حد یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان کا پیغام بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے اور وہ تمام عالم انسانیت کے شاعر کہلانے کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔ نفس مضمون سب کے ہاں ایک ہے خواہ کوئی پٹھانوں میں پیدا ہوا ہے یا سندھیوں اور پنجابیوں میں پھلا پھولا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی واعظ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

سندھی:۔ ملاں مار نہ مون، سبق پڑھاں کن سیکھاں زبان
'الف' اسانکی یار پڑھایو، 'ب' جي بانس نہ بون'
درد وظیفہ، نفل نمازون، اندر یو تون ھي تون
اسین آدم کنون اگ ھیاسین، آدم ذات نہ ھون
ادیون شاہ لطیف چوي آھین من جو محرم تون
ملاں مار نہ ....

ترجمہ:۔ ملا مار نہ موں۔ میں یہ تیرا درس پڑھوں یا دلبر کو یاد کروں
ملا مار نہ موں۔ یار نے مجھ کو الف پڑھایا ب کی نہیں بھائے کیوں
ملا مار نہ موں۔ ورد وظیفہ نفل نمازیں دل میں لیکن تو ہی تو ں
ملا مار نہ موں۔ ہم آدم سے پہلے آئے، آدم ذات نہ ہوں
ملا مار نہ موں۔ کہے لطیف اس کے تم محرم، پھر میں کس سے راز کہوں
ملا مار نہ موں ....

یہی مفہوم پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا کے ہاں بھی ملتا ہے۔ اس کی عبارت گو مختلف ہے۔ لیکن جذبات وہی ہیں۔ جو شاہ عبداللطیف کے۔

پشتو:۔ چہ م ستا دے بنگلی مخ وتہ کتلی دی
نور بیانہ دی ڈبل مخ وتہ کتلی دی

کہ خدا دیار پہ مخ کہ چا نظر شی
د بدنہ کاندی بل خوا دتہ نظر خوک

بے دستا دمخہ کون دے کہ مکان دے
بلند تو بلندم نہ پہ دے شی نہ پہ دا

کہ بل خط پہ عبادت بہ نظر نہ دکا
چہ نظر دکاندی ستا پہ خط و خال خوک

ترجمہ:۔ ایک بار جب سے تمہارے چہرے کو دیکھا ہے، پھر میں نے کسی اور کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا۔

میرے دوست کے حسن سے کوئی واقف نہیں، اگر آگاہ ہو جائے تو اس کا در نہیں چھوڑے گا اور اگر اس کے چہرے پر نظر پڑ جائے، تو کسی اور کی طرف نہ دیکھے گا۔

تیرے بغیر مجھے کون و مکان کی بھی ضرورت نہیں
میری تسلی کون سے ہوتی ہے نہ مکان سے

جو ایک بار تیرے خط و خال کی طرف دیکھ لے وہ
پھر کسی دوسری عبارت پر نظر نہیں ڈالے گا

حضرت سلطان باہوؒ اس نظریہ عشق کو اپنے ہی انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ وہ اللہ ہو کے سوا کسی اور ورد کی تلقین نہیں کرتے۔

پنجابی:۔ یار یگانہ ملسی تینوں جے سردی بازی لائیں ہو
عشق اللہ دے وچ ہو مستانہ ہوالائیں ہو

نال تصور اسم اللہ دے دم نوں قید لگائیں ہو

ذاتے نال جاں ذاتے رلیا تد ہو نام سدائیں ہو

ترجمہ :۔ اگر تو اللہ سے لَو لگانی چاہتا ہے تو سردھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہو جا۔ تب ہی تجھے تیرا محبوب یگانہ "اللہ" ملے گا۔

اور بلھے شاہ توان خیالات میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بہت زیادہ قریب نظر آتے ہیں وہ بھی واعظ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ وہ مختلف انداز میں اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں

پنجابی :۔ الف اللہ نال دتا دل میرا

میں نوں 'ب' دی خبر نہ کائی

'ب' پڑھیاں مینوں سمجھ نہ آوے

لذت الف دی آئی

ع تے غ نوں سمجھ نہ جاناں

گل الف سمجھائی

بلھیا قول الف دے پورے

جہڑے دل دی کرن صفائی

ترجمہ :۔ اللہ نے اپنے نام الف کے ساتھ میرا دل باندھ دیا ہے۔ اب مجھے 'ب' کی کیا خبر۔ 'ب' تو میری سمجھ سے بالا ہے۔ مگر میں الف کی لذت سے آشنا ہو چکا ہوں۔ مجھے ع، غ کی بھی پروا نہیں۔ صرف 'الف' ہی دل کی صفائی کے لیے کافی ہے۔

واعظ بلھے شاہ کو زبردستی الف سے آگے پڑھانے کی کوشش کرتا ہے، مگر وہ شور مچا دیتے ہیں کہ الف یعنی اللہ کی ذات کے آگے تو کوئی شے ہی نہیں ہے واعظ جب سختی سے آگے پڑھنے کی تلقین کرتا ہے تو بلھے شاہ پکار اٹھتے ہیں۔

پنجابی ملّا مینوں مار دا ای

ملّاں مینوں مار دا ای

ملّا مینوں سبق پڑھایا

الفوں اگے کجھ نہ آیا

اوہ ب ای ب پکار دا ای

ملّا مینوں مار دا ای

ترجمہ :۔ مولوی مجھے مارتا ہے اور مجھے کہتا ہے کہ الف سے آگے پڑھو وہ 'ب' پڑھاتا ہے۔ مگر میں نہیں پڑھتا کیونکہ الف سے آگے کچھ نہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی ہوں یا رحمان بابا، سلطان باہو ہوں یا بلھے شاہ، سب کے کلام میں ایسے ہی گنجینہ ہائے گراں مایہ ملتے ہیں، جو تصوف کے ادق مسائل کو ایک معمولی سا نکتہ بیان کر کے سمجھا دیتے ہیں۔ ایسے نکتہ آفریں شاعر پر اس کردار کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں، جو سلوک و معرفت کی راہ میں ان کے مدمقابل طاقت بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی، عبدالرحمان بابا، حضرت بابا بلھے شاہ اور سلطان باہو آپس میں کہیں ملے اور نہ ایک دوسرے کی زبان کو جانتے تھے۔ تاریخ میں کوئی حوالہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ ایک دوسرے کے کلام سے واقف رہے ہوں، لیکن اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے قلوب الگ الگ تھے اور آواز ایک ہی تھی۔

اردو زبان و ادب کو سندھی، پشتو اور پنجابی ایسی علاقائی زبانوں کے توسل سے شاہ عبداللطیف بھٹائی، عبدالرحمان بابا، حضرت بابا بلھے شاہ اور سلطان باہو کے کلام کا جو مشترکہ سرمایہ ملا وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سرمایہ، پاکستان کا ثقافتی ورثہ ہے۔

اس باب کے آغاز میں اردو کے جو اشعار منظوم کئے گئے ہیں۔ وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہی کلام کا ترجمہ ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

سندھی :۔ الست بربکم، جڈھن کن پیو مر

قالوا بلیٰ، قرب سین، تڈھن تت چیو مر

تعین وی کیوم، وچن ویڑھیچ سین

فیکون، فذا کرونی، کھیائین سین کئی

عبدالرحمٰن بابا نے اسی مضمون کو اس شعر میں واضح کیا ہے۔

پشتو :۔ زہ پہ تا باندے مین یم لہ ازلہ

نہ چہ کرے م تن ورنج ولا ابتدا

ترجمہ :۔ میں نے آج سے محبت کی ابتدا نہیں کی، میں تو ازل سے عاشق ہوں۔

بابا بلھے شاہ نے بھی عشق ازل کا ذکر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور رحمان بابا کے سے انداز میں کیا ہے۔

پنجابی نی مینوں لگڑا عشق اوّل دا

اوّل دا روز ازل دا!

وچ کڑاہی تل تل جاوے

تلیاں نوں چاتل دا!

نی مینوں لگڑا عشق اوّل دا

ترجمہ :۔ میں آج سے نہیں روز اول سے عشق میں گرفتار ہوں، یہ عشق مجھے بہت سے مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور یہ عاشقوں کو بھی پکا عاشق بنا دیتا ہے۔ میں تو پھر بھی ازل سے عاشق ہوں۔

شاہ عبداللطیف اور ان کے ہمعصر شعراء کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا پیغام کسی خاص علاقے یا مخصوص طبقہ کے لئے نہیں، بلکہ تمام بنی نوع انسانیت کے لئے ہے۔ وہ عشق کے پیامبر ہیں اور عشق نسلی، قبائلی اور علاقائی حدود اور تعصبات سے بالاتر ہے۔ وہ دوسروں کو بھی اس قسم کے تعصبات سے دامن بچانے کی ہدایت کرتے ہیں اور خود بھی تنگ نظری سے متنفر ہیں۔ ان کی نظروں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں سے محبت کرنا انسان کا اوّلین فرض ہے، جو اس کی زندگی کو قیمت اور اہمیت بخشتا ہے۔ یہ عشق انسان کو حیوانیت کے تنگ و تاریک دائرے سے نکال کر انسانیت کی اس معراج تک پہنچا دیتا ہے، جو خالق حقیقی کے ہاں اس کی اصل منزل ہے۔ اس عشق میں اسے خود کی بھی پہچان نہیں رہتی۔ وہ محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اس کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے ؎

سندھی :۔ هوت تنهنجي هنج ۾ پچين ڪيهه پرياڻ

ونحن اقرب اليه من حبل الوريد تنهنجو تو هين ساڻ

پنهنجو آهي پاڻ، آڏو ڏيهين ڪي

ترجمہ :۔ تمہارا محبوب تمہارے ہی پاس ہے۔ تم کیوں اس کی تلاش کر رہے ہو جبکہ وہ تو تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

اس تصور میں شاہ عبداللطیف نے عشق اور عاشق کے بارے میں بہت سی

باتیں کہی ہیں۔ ان کے نزدیک عشق، ذات برادری سے بالاتر ہوتا ہے، بقول رحمٰن بابا:-

پشتو:- بے لہ عشقہ م کہ عیب دے کہ ہنر دے
مالہ ځانہ دے غوڅ کړے ہر پیوند

زۂ عاشق یم سروکار م دے لہ عشقہ
نہ خلیل نہ داؤدزی یم نہ مہمند یم

ترجمہ:- عیب ہے یا ہنر سوائے عشق
قطع کر دی ہے میں نے ہر پیوند
کام ہے عشق میں عاشق ہوں
نہ داؤدزی ہوں نے خلیل و مہمند

حضرت سلطان باہو نے اسی تصور کو ان اشعار کا جامہ پہنایا ہے۔

پنجابی:- نہ اوہ ہندو، نہ اوہ مومن نہ سجدے دین مسیتی ہو
دم دم دے وچ ویکھن مولا جنہاں جان قضا نہ کیتی ہو
اوہناں دے نیں دوانے جنہاں ذات سائے رنگ کیتی ہو
میں قربان تنہاں توں باہو جنہاں عشق بازی کن لیتی ہو

ترجمہ:- نہ وہ ہندو ہیں اور نہ مسلمان اور نہ ہی مسجدوں میں جاکر سجدے کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی ہر سانس میں خدا موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ عقلمند ہوتے ہیں، لیکن لوگ انہیں دیوانے سمجھتے ہیں۔ میں ان پر جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہوں جو عشق حقیقی میں جذب ہو کر خالق کو پا لیتے ہیں۔

فرقہ وارانہ، علاقائی اور ذاتی امتیازات کے بتوں کو توڑ کر حضرت بابا بلھے شاہ تو عشق اور صرف عشق میں سرشار ہو کر ایک اور صرف ایک ہی محبوب حقیقی سے لگن کا اظہار ان اشعار میں کرتے ہیں۔

پنجابی:- بلھیا کی جاناں میں کون ......
نہ میں مومن وچ مسیتاں
نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پلیتاں
نہ میں موسےٰ نہ میں فرعون
بلھیا کی جاناں میں کون ......
نہ میں عربی نہ میں لاہوری
نہ میں ہندی شہر نگوری
نہ ہندو نہ ترک پشوری
نہ میں رہندا اوچ ندون

ترجمہ:- اے بلھے میں کیا جانوں کہ میں کون ہوں۔ نہ میں مسجد میں مقیم مومن ہوں اور نہ کفر کا پیروکار ہوں۔ مجھے اپنے پاک باز ہونے کا بھی دعویٰ نہیں اور نہ ہی مجھے کوئی پلید کہہ سکتا ہے۔ میں موسیٰ ہوں نہ فرعون۔ میں عربی ہوں نہ لاہوری اور نہ ہی ہندی شہر نگور کا باشندہ ہوں۔ میں ہندو ہوں۔ ترکی اور نہ ہی پشاور کا رہنے والا ہوں۔ میں ندون کا بھی رہنے والا نہیں۔ معلوم نہیں میں کون ہوں۔

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ان کے معاصرین نے ان ہی اخلاق حسنہ کا ذکر کیا ہے، جو اسلامی تعلیمات کی اساس ہیں۔ ان صوفی شعراء کے نظریات کے مطابق عشق الٰہی اور اعلیٰ و ارفع اخلاق لازم و ملزوم ہیں۔ خدا نے یہ دنیا بلاوجہ پیدا نہیں کی، بلکہ اس کا مقصد اولیٰ تھا۔ اس مقصد اولیٰ کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق بھی بنایا گیا۔ شاہ عبداللطیف اور ان کے معاصرین کے نزدیک اس ضابطۂ اخلاق کی پابندی اشد ضروری ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

سندھی:- پاڙُ م کنهن پاڙسين، ري ڳي دسيلي وڃ،
لالن تنهن لڏ، عشق جنهين جي اڳيين

ترجمہ:- جس شخص کا پیر و مرشد عشق ہے، وہ منزل مقصود کو پا لیتا ہے۔ آگے بڑھیے اور اپنے آپ کو یک لخت بھلا دیجئے۔

شاہ عبداللطیف کا ایقان ہے کہ اگر کوئی شخص عشق کو اپنا رہنما اور ضابطۂ اخلاق بنا لے تو وہ کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔ رحمان بابا نے اس نظریے کا اظہار یوں کیا ہے۔

پشتو:- عشق عاشق لہ دہ یو ښے پیر استاد شے
چہ بدل نہ وی دا ښے پیر استاد شے

ترجمہ:- عاشق کو عشق سے بہتر اور کوئی استاد میسر نہیں آ سکتا۔

عشق کی منزل تک رسائی کے لیے سلطان باہو محبوب کا سہارا لیتے ہیں اور اسی کے تصور میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ ان کی یہ فکر اور یہ سوچ معرفت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

پنجابی:- مکھ محبوب دا خانہ کعبہ عاشق سجدہ کردے ہو
دو زلفاں وچ نین مصلے جتھے چاروں مذہب ملدے ہو

ترجمہ:- محبوب کا چہرہ خانہ کعبہ ہے، جہاں عاشق سجدے کرتے ہیں۔ دو زلفوں کے درمیان آنکھیں مصلے ہیں جس پر چاروں مذہب ملتے ہیں۔

اور بابا بلھے شاہ تو عشق حقیقی کی منزل تک رسائی کے لیے براہ راست عشق مجازی کا اظہار کرتے ہیں، فرماتے ہیں۔

پنجابی:- میں کیوں کر جاواں کعبے نوں
دل کوچے تخت ہزارے نوں
کوئی سجدہ کعبے نوں کردے
ساڈا سجدہ یار پیارے نوں

ترجمہ:- میں کعبے کیونکر جاؤں۔ کوئی کعبہ کو سجدہ کرتا ہے، لیکن ہم اپنے پیارے محبوب کو سجدہ کرتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ان ہمعصر صوفی شعراء کے کلام میں ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی، جن میں خیالات کی ندرت کے باوجود یگانگت ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب شعراء کے سندھی، پنجابی اور سرحدی علاقوں کے عوام پر بڑے احسانات ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم کو ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب کا درس دیا۔ ان کے اس درس کی بدولت یہ سلری قومیں جو لسانی اعتبار سے جدا جدا ہیں، نظریۂ اسلامی کی روشنی میں ایک امت کہلاتی ہیں اسی نظریے کو علامہ اقبالؒ نے وسیع تر مفہوم عطا کیا۔ بقول حکیم الامت ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

صوفی شعراء کا یہی پیغام تھا، یہی درس تھا اور یہی عمل بھی۔

شاہ کی شاعری

مہرباں، مہرباں وا شگفتہ جبیں
میرے آنگن میں آتا ہے پیارا مرا
اس سے بڑھ کے ہے میرا وہ مہر جبیں
چاند اچھا سہی چودھویں رات کا

یہ خوبصورت رنگِ تغزل، شاہ عبداللطیف بھٹائی ہی کا ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کے لیے فکر و تجسس کی راہیں خود وضع کیں۔ وہ بلاشبہ ایک عظیم شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت، اس دور کی رہینِ منت ہے، جب سندھی ادب و شعر نے اورنگ زیب عالمگیر کی رحلت کے بعد برکوچک کے ہمہ گیر سیاسی انتشار کے زمانے میں شاہ عبداللطیف جیسا لافانی شاعر اور زندہ جاوید صوفی پیدا کیا اور اردو نے بھی مغلوں کے عہد زوال میں باقاعدہ ایک زبان کی شکل اختیار کرلی اور ولی دکنی، مرزا مظہر جانجاناں، میر تقی میر، سودا، اور میر درد ایسے عظیم شعراء کو جنم دیا۔ پشتو زبان کے آتش نوا شاعر خوشحال خاں خٹک بھی اسی عہد کے ماضی قریب میں موجود تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وادی مہران کے یہ سرحدی مغنی جنھیں سندھی عوام بڑے پیار، محبت اور عقیدت کے ساتھ "لال لطیف" کے پیارے نام سے یاد کرتے ہیں اسی روحِ احیاء کے مظہر تھے جو سترھویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں برکوچک کے ہر گوشے میں غیر معمولی قوت کے ساتھ دوڑ رہی تھی اور ادب و مذہب کے ہر گوشے میں اصلاح و تجدید یا تعمیر و تبدل کی بنیاد ڈال رہی تھی۔

اس حقیقت سے بطلان ممکن نہیں کہ ہر تاریخ کے انقلابی دور میں ہمیشہ عظیم شخصیات جنم لیا کرتی ہیں۔ خود انقلاب کی اپنی روح اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والے اصحاب کو منظرِ عام پر لائے۔ چنانچہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت کے وسیع علاقوں میں جو انقلاب رونما ہوا اس نے سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کو جنم دیا۔ شاہ عبداللطیف نے سندھ کے اہم سیاسی دور میں اپنی زندگی گزاری۔ یہ وہ عہد تھا۔ جب سندھ میں شورش اور آزادی کی طاقتیں بیک وقت کام کر رہی تھیں۔ کلہوڑا خاندان کے حکمرانوں نے سلطنتِ مغلیہ کی سیاسی و تمدنی بالادستی سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ لیکن سندھ ایک مسلسل سیاسی اضطراب میں مبتلا تھا شاہ عبداللطیف بھٹائی کی زندگی کا بیشتر حصہ کلہوڑا خاندان کے فرمانرواؤں کے عہدِ اقتدار میں بسر ہوا اور یہی ان کی شاعری کا دور تھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کو سندھی شاعری کا سب سے بڑا مجتہد اور ریفارمر قرار دیا جاتا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر انسان دوستی کے علمبردار تھے اور ایک پیامبر بن کر قوم کے سامنے آئے۔ یہی خوبی علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کو حکیم الامت بنا گئی۔ شاعرِ مشرق کی طرح شاہ صاحب کا تمام کلام بھی انسانی دردمندی کا عکاس ہے۔ رشید احمد لاشاری کا خیال ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا زمانہ خاندانِ مغلیہ کے زوال اور اردو زبان کے ارتقاء کا زمانہ تھا۔ اردو، شاہجہان کے زمانے میں "اردوئے معلی" کا لقب حاصل کر چکی تھی۔ سابق سندھ کا علاقہ اس وقت شاہانِ مغلیہ کا باجگزار تھا۔ اٹل اور چنچل شہر دہلی کے مشہور موسیقار بھٹ شاہ پر حضرت شاہ عبداللطیف کے خاص مصاحبین کی حیثیت میں رہا کرتے تھے اور شاہ کے دربار میں ہندی موسیقی کے ساتھ اردو شاعری کی جھلکیاں بھی موجود تھیں۔ اس لیے گمانِ غالب ہے کہ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے پشتو، بلوچی اور پنجابی۔ سب زبانوں کو اپنی مادری زبان سندھی کیساتھ ایک مرکز پر لا کھڑا کیا اور ان سب کے اختلاط سے اردو زبان کی ترویج و ترقی کو ملحوظ رکھا، تاکہ وہ آگے چل کر ایک مشترکہ قومی زبان کی حیثیت حاصل کر سکے۔

یہ توجیح بعض ناقدین کی نظر میں تحقیق طلب ہے، لیکن اس امر سے کسی کو انکار نہیں کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھی زبان کو فروغ بخشا۔ وہ اپنا پیام اپنے کلام کے ذریعے سندھ کے عوام کو ان کی زبان میں پہنچانے میں مصروف رہے۔ یہ ایک مستحسن جذبہ تھا۔ شاہ صاحب عربی کی شاعرانہ لذت سے آشنا تھے۔ وہ فارسی کا فہم و ادراک بھی رکھتے تھے۔ اس لیے انھیں اس دور کے عوام کو اپنا نظریہ، جو حقیقت میں اسلامی اور قومی نظریہ تھا، سمجھانے میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ انھوں نے لوگوں کی زبان میں ہی لوگوں سے باتیں کیں۔ اس وقت نہ تو کسی "ازم" نے سر اٹھایا تھا اور نہ ہی کسی "پسندی" کے پسند یا نہ پسند ہونے کا مسئلہ درپیش تھا۔ شعرائے متاخرین ترقی پسندی یا رجعت پسندی کی الجھنوں سے کوسوں دور تھے۔ ان کے دلوں میں فقط ایک ہی نظریہ تھا۔ یہ نظریہ انسان دوستی سے عبارت تھا۔ جس میں پاکیزگی بھی تھی سچائی بھی۔ دردمندی کے جذبات اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنا نظریہ، اپنے اشعار کی زبان ہی میں بیان کیا۔ وہ کسی "ازم" یا مستعار نظریہ کے قائل نہ تھے۔ بقول ڈاکٹر نبی بخش بلوچ:

"شاہ، مولانا روم کے کلام کو ہمہ وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے، مگر متاثر نہیں تھے۔ یہ سچ ہے کہ حکمت رومی سے بخوبی آگاہی کے باوصف شاہ صاحب نے چراغ سے چراغ جلانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ ان کے کلام کی فکری سطح یہ واضح کرتی ہے کہ موصوف کو اظہار اور بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ اگر تحقیق کا شعور بیدار ہو اور فکر و فہم کا ادراک حاصل ہو تو شاہ صاحب کے کلام اور فاضلانہ شخصیت کی تمام خصوصیات نکھر کر سامنے آجاتی ہیں۔

فی زمانہ، جہاں تک نظریاتی مباحث کا تعلق ہے، اس کی مدت نصف صدی سے بھی کچھ کم ہے آج کے شعراء اور دانشور جب نظریہ حیات کی بحث شروع کرتے ہیں، تو وہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی خود ساختہ اصطلاحات میں الجھ کر اتنی دور پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے اذہان بسا اوقات بغاوت کے پر تولنے لگتے ہیں اور تو اور بعض عالی ظرف اور وسیع الدماغ دانشور اس بغاوت کو بھی ادب کی زبان میں "صحت مندی" کی علامت قرار دیتے ہیں، مگر شاہ عبداللطیف کے ہاں ایسی کوئی نظریاتی بحث یا گفتگو نہیں ملتی، وہ علاقائیت کو اس حد تک نہیں اچھالتے کہ اس سے وطن اور قومیت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ وہ عشق مجازی کے رنگ میں، خواہ وہ محبوب سے ہو یا وطن سے، دین کی باتیں کرتے ہیں اور یہی دین، جو پیار اور اخوت کا سرچشمہ ہے ہم سب کو اتحاد و یگانگت کا درس دیتا ہے۔

شاعری کا پس منظر

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے عہد کے سیاسی اور معاشی حالات پیش نظر ہوں۔ ان ہی حالات نے شاہ عبداللطیف کے سازِ جان اور بربطِ دل پر مضراب کا کام کیا۔ ان کا زمانہ انتشار کا زمانہ تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کریم بخش خالد نے لکھا ہے کہ اس عہد کی یہ خصوصیت تھی کہ اس سرزمین کے مختلف علاقوں میں، ایک نئے فکری دور کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ شمالی ہند کی حد تک دوآبہ گنگ و جمن میں اردو شاعری کے خد و خال آراستہ کئے جا رہے تھے۔ اور وادیٔ مہران میں سندھی زبان کی عروسِ ادب کی مشاطگی کا کام سلیقے سے ہو رہا تھا۔ شاہ کی روح نے ان حالات کو اپنے میں جذب کر لیا اور آخر انھوں نے سندھی زبان میں ایک ایسے مکتبۂ شعر کی بنیاد ڈالی جو اپنی روحانی اور فنی اقدار کی بنا پر ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کس مکتبہ شعر سے تعلق رکھتے تھے؟
اس کا جواب خود ان کی شاعری سے مل جاتا ہے۔ شاہ صاحب ایک زندہ جاوید صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے تخیل و تصور کا سارا روحانی مواد اپنے وجدان سے حاصل کیا اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر زبان کے عظیم شعراء کی وجدانی بیداری کے لیے ناگزیر ہے کہ عظیم سیاسی معاشی تمدنی طاقتیں حرکت پذیر ہوں اور زندگی اپنی تجدید کے لیے پوری طرح سرگرم عمل ہو جائے۔ مثال کے طور پر مولانا روم، خواجہ فریدالدین عطار اور سعدی شیرازی کا عہد شعر وہ عہد ہے، جب منگول و تاتار کے حملوں نے تمام وسط مشرق کو تہہ و بالا کر دیا تھا اور اسلامی ایشیا میں ایک نئی تمدنی اور روحانی زندگی کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جب صدیوں سے قائم شدہ سیاسی اور سماجی نظام کا خاتمہ ہو جاتا ہے، تو عام زندگی میں سخت مادی افراتفری اور روحانی انتشار پھیل جاتا ہے اور یہی وہ زمانہ ہوتا ہے، جب شاعر کی زندہ جاوید وجدانی قوتیں جاگتی ہیں اور عظیم شعراء اپنے وجدانی اور عرفانی نغموں سے زندگی کو نئی لطافتوں اور نئی قوتوں سے معمور کر دیتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف اسی مکتبہ شعر سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ خود ان کا مکتبہ شعر بھی وہی ہے جو مولانا روم، مرزا عبدالقادر بیدل (یہ بھی شاہ عبداللطیف کے ہمعصر ہی تھے) خواجہ فریدالدین عطار، اور سعدی وغیرہ کا تھا۔ شاہ اور ان کے ہم مذاق متقدمین کے مکتبہ شعر کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں مادی زندگی کی بے رحمانہ تشریح کی جاتی ہے اور زندگی کی ان اقدار کو نمایاں اور اجاگر کیا جاتا ہے جنہیں لوگ مادی آسائش اور جسمانی تنعم کے زمانے میں بھلا دیتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف نے آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش، جاہ و اقتدار کے لیے انسانوں کو ایک دوسرے سے درندوں کی طرح جنگ آزما پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ جابر امراء اور عیش پسند جاگیردار کس طرح عوام کا خون پی پی کر پھل پھول رہے ہیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور روحانیت کے آدرشی اصولوں کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے اور خدایان مجازی بری طرح عوام کا روحانی اور مادی استحصال کر رہے ہیں۔ ان حالات نے ان کے وجدان کو بیدار کر دیا۔ اور انہوں نے اپنی پر سوز اور لافانی شاعری کے ذریعے روحانی انقلاب کا ایک ایسا جاودانی نغمہ چھیڑا، جو نہ صرف اپنے لیے، بلکہ صوتیت کے لحاظ سے بھی انوکھا اور نیا تھا۔

مختصر یہ کہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، اس عہد احیاء کے ترجمان تھے، جو اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کی طاقت کے انتشار کے زمانے میں شروع ہوا اور جس نے مختلف علاقوں میں مذہبی، ادبی اور تمدنی نشاۃ ثانیہ کی رفتار کو تیزی سے تیز کر دیا خصوصیت کے ساتھ اس تحریک سے علاقائی زبانیں متاثر ہوئیں جہاں تک شاہ عبداللطیف کی شاعری اور زندگی کا تعلق ہے اس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ان کی شاعری اور زندگی میں تضاد نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے اپنے کلام کے ذریعے دوسروں کو جو پیام دیا انہوں نے اپنی زندگی کے لیئے اسے حرز جاں بنایا۔ یہی ان کی شاعری کا پس منظر بھی ہے اور پیش منظر بھی۔

رنگ تغزل

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کی بہت سی خصوصیات ہیں، لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا رنگ تغزل ہے جس پر تصوف کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ ان کے تصوف کا مرکز فلسفیانہ تفکر نہیں، بلکہ واردات عشق ہے اور یہی ان کے کلام کی ہمہ گیر مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ کی شاعری کے موضوعات دقت نظر کے آئینہ دار ہیں، مگر حیرت کی بات ہے کہ تفکر کے باوصف شاہ صاحب کے تمام کلام میں وہ شیرینی، لطافت، حلاوت، برجستگی بے ساختگی، نرمی اور سادگی پائی جاتی ہے، جسے قدما نے تغزل یا شیریں بیانی کہا ہے۔ شیریں بیانی خود ایک تغزل ہے۔ تغزل کو غزلوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ہر لطافت شعر کا دوسرا نام تغزل رکھا جا سکتا ہے۔ مناسب و موزوں الفاظ، بیان کی لطافت، طرز ادا کی شعریت، یہ سب ہی تغزل کی جان اور شان ہیں۔ اس طور پر شاہ صاحب کا تمام کلام اس لطافت شعری کا منبع اور مخزن ہے، جسے عرف عام میں تغزل کہتے ہیں، پیر حسام الدین راشدی نے اپنی ایک تقریر میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جس حد تک شاعری کا تعلق ہے، شاہ صاحب سب سے بلند ہیں۔ رومی کی مثنوی میں اتنی نرمی اور لطافت نہیں ہے جیسی شاہ کے رسالے میں ہے۔ شاہ کے کلام میں ایسی نرمی اور لطافت ہے، جیسی ریشم میں، جو نرم و نازک ہوتا ہے جیسے چھونے میں ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ بالکل اسی قسم کی لذت اور لطافت شاہ کے کلام میں ہے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی اور مولانا روم کے کلام کا موازنہ کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ رومی کے ہاں حکمت ہے۔ شعریت نہیں۔ ان کے مقابلے میں شاہ صاحب کے یہاں فلسفہ اور حکمت شعری کی لطافت یکساں ملتی ہے۔ یہی خوبی شاہ کو رومی سے تمیز کرتی ہے اور اس کا نام تغزل ہے۔ ہر لطیف احساس شاہ صاحب کے کلام میں لذت اور لطافت محسوس کرتا ہے، وہ بیدار مسائل کی گتھیاں اپنے شعری حسن سے سلجھاتے ہیں۔ ان کے دل کے گداز سے جو تغزل پیدا ہوتا ہے، اس کی بدولت وہ صاحب دل اور صاحب امروز شاعر کہلاتے ہیں، جو زمانے کے سمندر سے گوہر ہائے فردا نکالتا ہے۔ شاہ صاحب کی شاعری اس امر کی غماز ہے کہ ان کے ہاں تغزل کا رشتہ دماغ سے کم اور دل سے زیادہ ہے۔

غزل کے معنی محبوب سے باتیں کرنے کے ہیں۔ غزل کا اپنا ایک مزاج اور اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اسلوب بیان سے مراد تغزل لی جاتی ہے۔ حسن غزل کی جان ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نزدیک حسن، حسن ازل ہے۔ وہ غزل میں بھی اللہ کی وحدانیت کے قائل ہیں اور ہر رنگ و روپ میں اسی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ وہ صوفیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن کا عقیدہ وحدت الشہود ہے۔ وہ محبت کی لطیف کشمکش کو زندگی کا موقعہ سمجھتے ہیں، غزل کے پیرایہ میں محبوب اور اس کے حسن سے متعلق ان کی جو گفتگو ہوتی ہے وہ بڑی معنی خیز، پر مغز اور اثر انگیز ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کے رنگ تغزل کا ترجمہ:-

اے چاند
تم صرف رات کو چمکتے ہو۔
مگر میرا محبوب تو ہر وقت تاباں و منور ہے۔
اے چاند
میں نے دل کی کیفیت بیان کی ہے۔
خواہ تم خوش ہو یا ناراض۔
تمہاری دو آنکھیں اور تیسری ناک ہے۔
لیکن تم میرے محبوب کے ابرو کی تاب نہیں لا سکتے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ہاں عشقیہ شاعری کا مزاج وہی ہے، جو غزل کا مزاج ہے۔ غزل کا موضوع بالعموم محبوب ہی ہوتا ہے اور شاہ صاحب ایسے دور اندیش اور صاحب بصیرت شاعر محبوب کی اداؤں اور اس کے حسن کی رنگینیوں میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ شاہ صاحب کے دور میں سندھی زبان کی شاعری غزل

کی صنف سے محروم تھی اور ان کا مسلک تصوف تھا۔ وہ صوفی شاعر تھے۔ درویش ہونے کے ناطے سے وہ محبوب سے براہ راست مخاطبت کرتے تھے۔ ان کا محبوب، محبوب حقیقی ہے اور اسی اسلوب بیان میں تغزل سے ان کا فطری رشتہ ثابت ہوتا ہے۔ علی محمد مجروح کے بقول "تغزل سے مراد ہے ہر خیال کو حسن و عشق کے لطیف و دلگداز پیرایہ میں بیان کرنا۔ شاہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات ایک تسلیم شدہ حقیقت بن جاتی ہے کہ شاہ کے تغزل میں حسن و لطافت کا ایک ایسا اچھوتا امتزاج ہے جس میں محبت کے پرسوز جذبات بھی ہیں اور حسن کی شوخی اور انجمن آرائی بھی۔ وصل کی امنگیں بھی ہیں اور جدائی کے داغ اور درد بھی ؎

چودھویں شب کی دودھیا چاندنی بکھری ہوئی ہے،
میرے گھر، میرے محبوب کے آنے کی خبر گرم ہے۔
ان کو دیکھے ہوئے اک زمانہ ہوا۔
خدا معلوم اب وہ کیسے ہوں گے۔
کتنے سورج طلوع ہو کر ڈوب گئے، مگر میں ان کے لیے ترستی ہوں۔
افسوس کہ ان کی جدائی میں اتنے برس بیت گئے۔
اور میں انہیں ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں کر سکتی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا رنگ تغزل، اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں اجاگر ہوتا ہے۔ وہ غزل کے معاملے میں بحر، ردیف اور قافیہ کی حدود و قیود کی بھی پروا نہیں کرتے، وہ انداز بیان اور طرز تخاطب کو ہی اولیت دیتے ہیں۔ سسی، ماروی، مومل، سورٹھ اور لیلاں کی پرسوز آہیں ان کا موضوع ہیں اور وہ معرفت اور تصوف کے عمیق اور دقیق موضوعات کو نظم کرتے وقت بھی تغزل کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ان اشعار کے ترجمہ سے ان کے اسلوب سخن، تغزل کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ؎

"میں نے جب کتاب وصل کے اوراق کا مطالعہ کیا، تو اس میں مجھے تم ہی تم نظر آئے۔
اس کے بعد میری زبان نے کسی ساعت کوئی دوسرا نام نہ لیا۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رنگ تغزل کو واضح کرنے کے لیے ان خارجی حالات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے جس کے اشارات 'پیام لطیف' میں یوں ملتے ہیں: "شاہ لطیف نے اپنے زمانے کے خارجی انقلابات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ان کی زندگی سندھ میں ہولناک کشت و خون اور سیاسی تبدیلیوں کا تماشا کرتے گزری۔ ان کے زمانے میں مغل سلطنت تباہ ہوئی۔ بالاجی باجی راؤ نے دہلی کی گلیوں میں خون کے دریا بہا دیے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سندھ میں کلہوڑا خاندان کا اقتدار بڑھا۔ ایرانیوں اور افغانیوں نے اس سرزمین کو روندا۔ کھیتیاں تباہ ہوئیں۔ دریا امڈے اور گاؤں کے گاؤں بتاشے کی طرح گھل گئے۔ ہر طرف دکھ ہی دکھ پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف آہ و بکا اور نالہ و شیون کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ مگر اس دکھ سے بھرے ہوئے زمانے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک ویران ٹیلے پر بیٹھے عرفان الٰہی کے نغمے الاپ رہے تھے ان کے تنبورے کی رسیلی تانیں دکھی دلوں کو پکار پکار کے تسکین اور سکون کے پیغام سنا رہی تھیں۔ اتنے بڑے انقلابات سندھ میں کبھی نہ دیکھے تھے شاہ صاحب نے ان کو دیکھا اور منہ پھیر لیا انہوں نے اپنے کلام میں ان خارجی انقلابات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ان کے کلام میں ان تباہیوں کا عکس اگر ملتا ہے تو ان کے پیغام محبت میں جو شاید انہیں تباہیوں کی وجہ سے اتنا قوی اور اتنا شدید ہے۔ شاہ عبداللطیف جانتے تھے کہ دلوں کو تسکین دینے والی ایک ذات باری ہے۔ انہوں نے دلوں کی تسکین کے لیے لوگوں کو معرفت کی رمزیں سمجھائیں وہ کہتے تھے کہ،

"دلوں کے روگ دور کرنے والا اللہ ہے۔
وہی داتا ہے، وہی دیتا ہے۔
اور وہی چھین لیتا ہے۔
جو کچھ مانگو اسی سے مانگو
وہی سب کا والی ہے۔
وہی تدبیر ہے۔
وہی تقدیر
وہی سب کچھ ہے
اسی کی آرزو کرو۔
اسی کی تمنا میں جیو۔
اور اسی کی حسرت کے لیے مرو۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے رنگ تغزل میں ہر ہر جگہ محبوب حقیقی سے عشق نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں غزل کی باتیں ہیں اور غزل کے وہ الفاظ ہیں وہ مضامین ہیں، جو تغزل کی جان کہلاتے ہیں۔ ان کے شباب کے کلام کا مطالعہ کیا جائے یا بلوغت کے بعد کے افکار کا، جانِ تغزل کی تابانیاں اور رنگینیاں دکھائی دیں گی۔ مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتہ کے بقول "ان کی جوانی کے اشعار تغزل سے پر ہیں نہ صرف جوان ان سے لطف اٹھاتے اور تمتع پاتے ہیں، بلکہ سن رسیدہ پر بھی روحانی شباب کی لہر دوڑ جاتی ہے ان کے یہاں اول عشق مجازی کی چنگاری عارضی طور پر ان کے دامن میں سلگی، لیکن جلد ہی عشق حقیقی میں تبدیل ہو گئی۔ ان کی سورمیاں (ہیروئنیں) بظاہر مجازی معلوم ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت سب کا رخ معرفت کی جانب ہے۔ سب کی مشابہت روح سے ہے، جو اپنے اصلی منبع سے دور ہو کر اس کی لامتناہی جستجو اور تلاش میں رہتی ہیں اور مرنے کے بعد اس سے واصل ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر یہ وصال موت تک بھی میسر آئے تو باعث صد مسرت ہے۔ ان کی طلب اور تلاش ویسی ہے، جیسا کہ پروانے کی جستجو ستارے کے لیے یا رات کی دن کے لیے۔ شاہ لطیف فرماتے ہیں:

"معرفت حقیقی حاصل کرنے کے لیے بہت سے راستے ہیں۔
کوئی بھی راہ اس کا مشاہدہ کر سکتی ہے
ایک فقیر ہے
جس کے لاکھوں دروازے اور کروڑوں کھڑکیاں ہیں۔
میں جس طرف بھی نظر پھیرتا ہوں، اس طرف مجھے خدا کی جلوہ گری دکھائی دیتی ہے۔"

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ابیات کو تغزل کی جان کہنا ہی مناسب و موزوں ہے۔ اس لیے کہ یہ ابیات جلوت میں بھی لطف دیتے ہیں اور خلوت کے بھی ہم جلیس ہیں۔ یہ ابیات مغموم دلوں کی اداسیاں بانٹ لیتے ہیں اور ان کے دکھوں کا مداوا کر کے انہیں خوشیوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ جانِ تغزل کی تعریف بھی یہی ہے کہ انسان اپنے ہی خیالوں میں مست ہو کر غیر شعوری طور پر غزل کے اشعار گنگنانے لگے۔ اور شاہ عبداللطیف کے اکثر ابیات ایسے ہیں جنہیں ہر کوئی غیر شعوری طور پر گنگناتا ہے اور اس سے اپنی اداس اور پژمردہ تصویروں کو خوشی اور مسکراہٹ بخش دیتا ہے۔ بلاشبہ شاہ صاحب کے رنگ تغزل میں دل کی تمام باتوں کے علاوہ ترنم ریزی بھی ہے اور شیریں کلامی بھی، فصاحت و بلاغت بھی ہے اور طمانیت و لطافت بھی، بیقراری بھی ہے اور سکون بھی اور ان سب خوبیوں کے حامل شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ابیات گنگنا کر ہر کوئی لطف اور فیض اٹھاتا ہے۔

وائی اور بیت

ایک قادر الکلام شاعر کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص صنف شعر میں مقید نہیں کرتا، بلکہ شعر و ادب کی جملہ اوصاف کو اپنا تابع فرمان بنالیتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے رنگ تغزل کے ساتھ سردں کی صورت میں سندھ کے قدیم رومان ترتیب دیے ہیں اور ان رومانی داستانوں میں اور اس سے علیحدہ بھی دو اصناف سخن میں اپنی قدرت بیانی کے جوہر نمایاں کیے ہیں۔ یہ دو اصناف سخن ہیں۔ "وائی اور بیت"۔ وائی غزل کے مصرعوں سے مشابہ ہے اور بعض اوقات دو مصرعوں کے درمیان بھی "وائی" کہہ دی جاتی ہے، مگر وائی عموماً ایک ہی مصرعہ کی ہوتی ہے اور دو مصرعے مل کر غزل کا مطلع بن جاتے ہیں۔ وائی کے بعد بیت دوسری صنف سخن ہے۔ اسے قطعہ یا رباعی کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں اصناف میں خیال کی اکائی اور موضوع کے تسلسل کو مقدم گردانا جاتا ہے۔

وائی میں بعض اوقات مصرعے ٹوٹتے ہیں اور یہ تکرار اردو شاعری میں بھی پائی جاتی ہے مصرعے کے ٹوٹنے سے خیال کی اکائی اور موضوع کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بلکہ اس نوع کی تکرار اصل موضوع اور خیال میں حسن اور دلکشی پیدا کرنے کے لیے روا رکھی جاتی ہے شیخ ایاز نے ایسی ہی شاہ کی کئی وائیوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک وائی کا اردو ترجمہ:۔

کوئی نہ مجھ کو روکے
کھینچ رہی ہے پریت پیا کی، کوئی نہ مجھ کو روکے
اپنے ہی من کو سمجھاتے اپنے ہی آپ کو ٹوکے
کوئی نہ مجھ کو روکے

چڑھی ہوئی یہ چنچل ندیا اور یہ آدھی رات
پریتم ہے اس پار میں کیسے پکڑوں اس کا ہاتھ
یہ لہروں کے جھوکے
کوئی نہ مجھ کو روکے

رات کی اگنی سلگی ہوئی ہے دھواں سا ہے اس پار
میرے من میں آگ لگی ہے، لے چل مجھے اس پار
کیوں مجھے کوئی روکے
کوئی نہ مجھ کو روکے

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے ابیات، مصرعوں، قطعات اور رباعیات کی صورت میں ملتے ہیں۔ ان کے بلا تخصیص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسے ابیات کہنے کی بذات خود کبھی کوشش نہ کی، بلکہ یہ ابیات تو ان کی وجدانی کیفیت میں خود بخود ان کی زبان پہ آجاتے تھے۔ اردو اور فارسی شعر و ادب میں یہ فرق آمد اور آورد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف کی وائیاں اور ابیات ایک نوع کی آمد ہی ہیں۔ ایک اور وائی ملاحظہ ہو، اس کا انداز کس قدر شیریں اور ترنم ریز ہے ؎

سجناں موہے بھول نہ جانا

ہر موتی بھینٹ چڑھاؤں
جب تجھ سا ہیرا پاؤں
من ہی من میں مسکاؤں
سو جان سے واری جاؤں

میری جیون جوت جگانا
سجناں موہے بھول نہ جانا

یہ گیت لطیف کوی کا
سکھ چھینا ہے میرے جی کا
دو بھر ہے تجھ بن جینا
ٹوٹے نہ میری من دنیا

میرے من کو دھیر بندھانا
سجنا موہے بھول نہ جانا

ایسی ہی کئی وائیاں اور ابیات، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ترنم و دلکشی کا مظہر ہیں۔ یہ ترنم ریزی آواز کا جادو جگاتی ہے اور دلوں میں محبت اور احساس کی روح کو بیدار کردیتی ہے۔ محبت کی لگن کس دل میں نہیں ہوتی اور جب یہی لگن احساس بن جائے تو شاہ عبداللطیف کی وائی بن جاتی ہے۔ اس وائی کا منظوم ترجمہ بھی اپنا رنگ لیے ہوئے ہے۔ شاہ صاحب کے جذبات کو شاعر نے کس خوبصورتی سے ایک زبان سے دوسری زبان کے قالب میں ڈھالا ہے، ملاحظہ ہو:۔

پریت لگن اس یار کی سیکھو، میرا من برملے
سندر نگری سانجھ سویرے اپنی اور بلائے
او پریتم پردیسی مجھ کو تیری یاد ستائے

رین اندھیری، جگ والوں کو گہری نیند سلائے
مجھ برہن کو بن باسی کی بنسی تان سنائے
او پریتم پردیسی مجھ کو، تیری یاد ستائے

رہتے ہیں اس پریت ڈگر میں بیری تاک لگائے
ڈرتی ہوں، میری آہٹ سے کوئی جاگ نہ جائے
او پریتم پردیسی مجھ کو تیری یاد ستائے

تیری چھل بل، تیری چھب ڈھب نینوں کو ترسائے
ہائے من کی آس تجھ کو کیا کیا روپ دکھلائے
او پریتم پردیسی مجھ کو تیری یاد ستائے

ان وائیوں کے علاوہ اب کچھ ابیات کی جھلکیاں بھی ملاحظہ ہوں ؎

لاکھ دروازوں کا قصر پرشکوہ
اور ہر جانب کروڑوں کھڑکیاں
جس طرف بھی دیکھتا ہوں سربسر
اس طرف آتا ہے وہ مالک نظر

میرے در پہ ہے لوگوں کی منڈلی کھڑی
میرے پیارے کی سب لوگ باتیں کریں
میرے گھر میں تو ہے آج اتری خوشی
جن کو جلنا ہے، جلتے ہیں، جلتے رہیں!

صبح دم اٹھ کے محبوب کے کان میں
یہ سندیسہ ہمارا سنانا سجن!

تجھ پہ ہم غمزدوں کی ہیں آنکھیں لگی
دیکھ ہم کو نہیں بھول جانا سکھی

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی وائیاں اور ابیات، عام آدمی کی زندگی اور اس کے جذبات کا حسین مرقع ہیں. لیکن شاہ صاحب ان نظاروں کا تماشا کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں. وہ دلوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی آنکھیں چہروں پر نہیں رکتیں، بلکہ دلوں کو ٹٹولتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہزاروں لوگوں کے جذبات و احساسات سے شاہ صاحب کا معصوم اور پاک دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے ۔

کافیاں ہی کافیاں

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کافیاں بھی ان کے کلام کی روح ہیں اور سندھ کے گوشے گوشے میں مقبول ہیں۔ 'کافی'، ایک خاص دیسی صنف سخن ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ کافی ہے یعنی جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ اپنی جگہ ہر ایک لحاظ سے مکمل ہیں. سندھی شاعری میں بعض اہل علم کے نزدیک کافی اور وائی علیحدہ علیحدہ اصناف ہیں۔ تاہم ان میں ایک واضح فرق موجود ہے. کافی بڑی حد تک بیت کے قریب ہے، شاہ عبداللطیف نے جس انداز میں کافیاں لکھیں، بعض مقلدین نے اسی انداز میں اور بعض نے عروض کی پابندی کے ساتھ اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے. کافی وہ وزن نہیں رکھتی جو عروض سکھاتا ہے۔ اس کے اپنے بول ہوتے ہیں اور اپنے ہی اوزان. علاقائی شاعری میں 'لوک گیت' عروض کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، مگر ان کا اپنا ایک وزن ضرور ہوتا ہے. شاہ کی داستانوں میں بھی کافیاں موجود ہیں، مگر جس سُر یا داستان میں جو کافی آتی ہے، وہ اسی داستان سے متعلق ہوتی ہے سر کلیان میں بھی چند کافیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ایک کافی کا ترجمہ رشید احمد لاشاری نے یوں کیا ہے ۔

ہر عبادت میں خیال یار ہے
اس کا ہر اک طالب دیدار ہے
سب سے ہیں آنکھیں مقدم عشق میں
یار کی صورت سے ان کو پیار ہے
ہے مگر خوبی نہاں اس بات میں
جس پہ قائم عشق کا معیار ہے
پیار اس سے صرف آنکھوں کا نہیں
اک انوکھی لذت گفتار ہے!
التجا جو کچھ بھی رکھتا ہے لطیفؔ
خوب واقف اس سے وہ دلدار ہے

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی کافیوں میں بھی محبوب کی باتیں ملتی ہیں۔ ان میں رات اور صبح کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کافی میں جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے. وہ محبوب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ایسی کافیاں بھی ہیں. جو مواد اور ہیئت کے اعتبار سے گیت کے قریب ترین ہیں. سجاد ترمذی نے ایک کافی کا ترجمہ گیت کے اس انداز میں کیا ہے ؎

کیسی آگ ہے پیار
سلگ رہی ہے تن میں
سلگ رہی ہے من میں
آگ نہیں بجھتی   چاہے کوئی ہزار

پیار کے بان نوکیلے   اور چھبر کاری وار
وہ دن بھی کوئی دن ہے   جو گزرے بن یار
تڑپ رہی ہوں کب سے   اب تو موڑ مہار!
مجھ بےکس بے بس کی   سن لے پروردگار
رہنا ہوشیار خبردار   قدم قدم پر ہے منجدھار
قدم قدم پر کیچڑ دلدل   راہیں نا ہموار!
اندھیارے میں ٹھوکر کھائے   خود کو جو سمجھے ناار
کب سے تیری راہ تکے ہے   پریمی تیرا اس پار
چلنے والے جا پہنچے ہیں   تو بھی نہ ہمت ہار
کیسی آگ ہے پیار
سلگ رہی ہے تن میں
سلگ رہی ہے من میں

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بعض کافیاں اور بعض گیت ایسے ہیں. جن کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی اس لیے کہ ان کافیوں اور گیتوں کا موضوع اور نفس مضمون ایک ہی ہے. یعنی ہجر و فراق. گیت بھی عورت گاتی ہے اور کافی بھی عورت کے جذبات کی غمازی کرتی ہے۔ فقط اتنا تفاوت ہے کہ گیت مروجہ اصولوں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور کافی میں یہ اصول روا نہیں رکھے جاتے ۔ اس سلسلے میں مثال کے لیے سر کھمبات کی داستان اوّل سے ایک کافی پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ اس کا ترجمہ حفیظ ہوشیارپوری نے کیا ہے ؎

رک جائے اگر شب گریزاں   آجائے وہ رشک صبح خنداں
اس طرح جلاؤں عشق کی جوت   ظلمت ہو تمام نور ساماں
رک جائے اگر شب گریزاں   آجائے وہ رشک صبح خنداں
جس کو ملا ہوت کا سہارا   ہنگامہ حشر اس پہ آساں
رک جائے اگر شب گریزاں   آجائے وہ رشک صبح خنداں
تمہید طلب ہے جگ ہنسائی   تکمیل طلب ہے جان بجاناں
رک جائے اگر شب گریزاں   آجائے وہ رشک صبح خنداں

یہ سب کافیاں دردمند دلوں کی ترجمان ہیں، جن میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا لہجہ مترنم اور مدھر ہے، دھیما دھیما اور رسیلا رسیلا۔ پنجابی ادب میں صوفی شاعر شاہ حسین کی کافیاں بھی ایسے ہی رنگ میں رنگی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کا موضوع شریعت اور طریقت ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بھی اپنی کافیوں میں عشق مجازی کے روپ میں عشق حقیقی کی باتیں کی ہیں ۔

بہاریہ نظمیں

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں بہاریہ نظمیں، عقیدت سے بھرپور ہیں۔ ان نظموں کا پس منظر سیدھا سادہ اور علاقائی ثقافت سے مملو ہے. کسان صبح اٹھتے اور ہل جوتتے ہیں۔ رہٹ کی موسیقی اور چڑیوں کے چہچہے جادو جگاتے ہیں. عورتیں آتی ہیں. پانی بھر بھر کر لے جاتی ہیں۔ کمہار مٹی کے برتن بناتا ہے. اوون سے دھواں اٹھ رہا ہے. عورتیں چرخے کات رہی ہیں۔ بچے جھولے جھول رہے ہیں۔ دوپہر کے وقت عورتیں ترنجن کی محفلیں گرم کرتی ہیں۔ شام کو الھڑ مٹیاریں بڑی محنت اور نفاست سے مانگ نکالتی ہیں. سیندور بھرتی ہیں۔ آنکھوں میں کاجل کی دھاریاں کھینچتی ہیں. گلے میں موتیوں کے ہار۔ باہوں میں چوڑیاں۔ ہاتھوں میں مہندی. جن کی یاد میں گاؤں کے بانکے چھبیلے جوان رانجھن کو چوپالوں میں بیٹھ کر سرد آہیں بھرتے ہیں۔ یہی نہیں، شاہ صاحب کی بہاریہ نظموں میں

اس زمانے کے سندھ کی معاشرتی زندگی بھی جھانکتی ہے۔ وہ کسانوں کا ذکر کرتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ کچھ کچے پکے گھاس پھونس کے جھونپڑوں میں ایک پکا مکان ہے جس میں مہاجن رہتا ہے۔ کسان غلہ بیچنے کے لیے دریا سے پردیس جاتے ہیں جن کے انتظار میں شام کے وقت ان کی محبوبائیں دریا کے کنارے کھڑی کشتیوں کے بادبان پہنچاتی ہیں ؎

شمال سے ہوا چلی　　نفس نفس میں قاہری
نہ پاس دلق نے ردا　　اور اس پہ یہ خنک ہوا
وہ جھونپڑوں کی اک قطار　　حیات پائے کاشکار
وہ جھونپڑے جو زور سے　　ہواؤں کے ہیں کانپتے
شمال سے ہوا چلی
نفس نفس میں قاہری
بس ایک کملی مختصر　　کہ کھینچ لو ادھر ادھر
وہ میرے تن کو ڈھانپ لے　　تو جاڑے سے اماں ملے
پڑاوے میں دبے ہوئے　　وہ برتنوں کے سلسلے
تو بھی اپنا عشق کیا!　　یوں نہ ڈھانپ رکھے گا
آنچ آگر پڑاوے سے　　دور ہو تو پھر گھڑے
تپ کے بک سکیں گے کیا!　　ہے تجھے یہی روا
دل میں ہے ترے نہاں　　ایک سوز جاوداں
جیسے آگ تند و تیز　　بھٹیوں کی شعلہ خیز
شمال سے ہوا چلی
نفس نفس میں قاہری
میرے دل پڑاوؤں سے　　تو بھی درس عشق لے
یہ ہے عشق کا معیار　　اس سے عشق کامگار
دل میں رات دن جلے　　آگ زور شور سے
پھر بھی تیرے سینے سے　　نہ اک ذرا دھواں اٹھے
سوز گل کا گل میں ہو　　ساز دل کا دل میں ہو
شمال سے ہوا چلی
نفس نفس میں قاہری

نظیر اکبر آبادی اور چکبست کو بہاریہ شاعری کا امام قرار دیا جاتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی بہاریہ نظمیں تو اردو میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی بہاریہ شاعری میں پیچھے نہیں ہے۔ ان کے کلام میں بھی ہوا، چاند، شبنم اور باد و باراں کا تصور ملتا ہے۔ شمال سے چلنے والی ہوا کو وہ "خنک تابی" سے تعبیر کرتے ہیں اور پنجابی شاعری میں اسی ہوا کو "پرے دی ہوا" کہا گیا ہے۔ شاہ عبداللطیف نے شمال سے چلنے والی ہوا کو جس بہار پرس کے ساتھ محسوس کیا۔ اس کو انہوں نے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا۔ نمونہ کے طور پر ان کی مذکورہ نظم پیش کی گئی ہے جس کا ترجمہ شباب رفعت نے کیا ہے ان کی ایک اور بہاریہ نظم کا ترجمہ محمد عامر فاروقی نے یوں کیا ہے ؎

یہ موسم بہاراں، یہ گلستاں یہ بیلا
مہکی ہوئی فضا ہے بھونروں کا جھنڈ آیا
اور میں نے اپنا ساتھی مدت کے بعد پایا
دکھ درد دور بھاگے ہنگام لطف آیا

فصل بہار آئی، فصل بہار آئی
بیلے کی شوخ کلیاں، کیا مسکرا رہی ہیں
اور صبح کی ہوائیں موتی لٹا رہی ہیں
اٹھو لباس پہنو، گلشن کو چل کے دیکھو
لالے کی سرخ کلیاں تم کو بلا رہی ہیں
فصل بہار آئی، فصل بہار آئی
فصل بہار آئی، پودوں نے سر نکالے
پیڑوں کے خشک پتے ٹھنڈی ہوا نے جھاڑے
اشجار نے جہاں کے دھانی لباس پہنے
موسم کو لطف بخشا، محبوب خوش ادا نے
فصل بہار آئی، فصل بہار آئی
دیکھو کھجور کیسی خشک کھڑی تھی پہلے
فصل بہار آئی قدرت نے بخشے گہنے
اترا رہی ہے کیسا پھولوں کا ہار پہنے
اٹھو لباس پہنو، دیکھو بہار چل کے
فصل بہار آئی، فصل بہار آئی
یوں تو ہر ایک موسم پر لطف دلکشا ہے
فصل بہار کی پھر کچھ اور ہی ادا ہے
پالے سے جل گئے تھے جو پیارے پیارے پودے
موسم نے ان کے سر کو سہرے کے تاج بخشے
فصل بہار آئی، فصل بہار آئی

بہاریہ نظموں کے معاملہ میں ناقدین، شاہ عبداللطیف بھٹائی اور نظیر اکبر آبادی کو یکساں خوبیوں کے حامل شاعر قرار دیتے ہیں۔ دونوں ہی عوامی شاعر ہیں اور بہاریہ شاعری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ بہار کا تصور ان کے ہاں بڑا نکھرا نکھرا اور خوشبودار ہے۔ شاہ عبداللطیف کی بہاریہ نظموں سے پتا چلتا ہے کہ انہیں بہار کی رت سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ خزاں کو تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، اس لیے کہ اس رت میں پھول مرجھا جاتے ہیں۔ پیڑ خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس بہار کی بہاروں کے کیا کہنے! اس کی نشیلی فضاؤں میں کلیاں کھل اٹھتی ہیں، پھول مہکنے لگتے ہیں۔ دلوں میں پیار کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس رت میں شاہ عبداللطیف میٹھی نیند سونے والوں کو بڑے پیار سے جگاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ لباس پہنو، باہر نکلو، صبح کی ٹھنڈی ہوا، پھولوں کی شادابی اور سبزے کی تازگی سے درس حاصل کرو۔ یہ بہار آفریں نظارے تمہیں کیف کا پیغام دیتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بہاریہ نظموں میں یہ سارا کیف و سرور، پایا جاتا ہے۔

پھل، پھول اور موسم

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی بہاریہ نظموں کے علاوہ، ان کے کلام میں جابجا پھلوں، پھولوں اور موسم کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں پھلوں، پھولوں اور موسم کو وہی اہمیت حاصل ہے، جو کہ نظیر اکبر آبادی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ امتیاز صرف اتنا ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے موسم اور پھولوں پر علیحدہ علیحدہ نظمیں کہی ہیں اور شاہ عبداللطیف نے ان چیزوں کو اپنے سروں میں شامل کر لیا ہے۔ سر مارودی اور سر سارنگ میں صحرا، ریگستان اور ان کے جملہ عوامل پھل پھول اور موسم کا احوال تفصیل سے ملتا ہے مثال کے طور پر۔

ادھر مالیریں بر کھا ہوئی ہے　　پرندے چہچہاتے اڑ رہے ہیں

مرے کپڑوں کا عالم دیدنی ہے کہ میلے ہے تنگے ادگی بھرے ہیں
تو عیبوں کا چھپانے والا ٹھہرا
خداوندا، تو میری لاج رکھنا

ہوا ہے جس جگہ سے میرا آنا
کسم کا پھول واں کھلتا نہیں ہے
جہاں شادی کے میلے ہوں وہاں بھی
مجھے کملی سوا جامہ نہیں ہے

جیسے تھا یاں آنا میرا ویسا ہی میرا جانا
اکثر جیسے برستی بوندیں پل پل ہے شرمانا
ان اونچے جو باروں میں جو جیون کے دن بیتے
زحمت، ذلت اور ستم تھے مجھ کو وہ یاد رہیں گے

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی نظر ہر ایسی شے پر مرکوز رہتی ہے، جس کا تعلق "نیچر" سے ہو۔ وہ فطرت کے حسن کی پنہائیوں میں کھو جاتے ہیں اور قدرت کی جلوہ سامانیوں کے روبرو سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ انگریزی کے مشہور شاعر 'ورڈز ورتھ' کے ہم جلیس ہیں اور انہیں شاعر فطرت کا خطاب دنیا انتہائی موزوں اور مناسب ہوگا۔ ایک عوامی شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کی نظر سب سے پہلے گاؤں، محلوں، پہاڑیوں، صحراؤں، کھیتوں اور باغوں پر جاتی ہے اور وہ قدرت کے ان ہی دلآویز نظاروں سے اپنی شاعری کا آغاز کرتے ہیں۔ شاہ جو رسالو، کے کلام سے عوامی زندگی کے معمولات کا پتا چلتا ہے۔ اس کا ورق ورق منظر کشی کا ایسا سماں باندھ دیتا ہے کہ بیقرار روحوں کو تسکین و طمانیت مل جاتی ہے۔ کھیتوں، پھلوں کے باغات، پھولوں کے تختوں اور سہانے موسم سے پرندوں کا بھی ایک تعلق خاص ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تذکرہ گل و بلبل، ان کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ محمد اسمٰعیل عرسانی رقمطراز ہیں۔

"تھر کے صحرائی حصہ میں کہ جہاں ریت کے ٹیلے ہی ٹیلے ہیں اور جو صرف بارش کے رحم و کرم پر آباد ہیں، وہاں ساون کی رت میں کیا کیا رنگ رلیاں رچائی جاتی ہیں، شاہ صاحب نے ریگستان کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اونٹوں کی دشوار تر سواری، مویشیوں کا ٹیلوں پر چرنا، مویشیوں کے پانی پینے کے حوض، کنوئیں، تلیاں، کنوؤں پر پانی بھرنے کے چرمی ڈول، پانی کھینچتے وقت چرخیوں کی گھڑگھڑاہٹ، بارش میں ٹیلوں اور ان کے زیر دامنوں کا سر سبز پیراہن اختیار کرنا، گھاس کا اگنا، پودوں کا بڑھنا، سبزہ زاروں کا لہلہانا، ان پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا چہچہانا، خودرو پھولوں کا وجد میں جھومنا، کاشی پھل، پھوٹ، لوکی، وغیرہ پھلوں اور سبزیوں کا کثرت سے پیدا ہونا، موسمی پرندوں کا اپنے عین موسم میں پیدا ہونا، بھونرے، تتلی، جگنو، اور دیگر حشرات الارض کا وجود میں آنا، جھیلوں میں پانی کا بھر جانا، تھر کی سیدھی سادی بھولی بھالی عورتوں کا گاگروں میں پانی بھر کے لے جانا، خودرو جنگلی پھولوں کا ہار بنا کر پہننا، الغرض یہ تمام باتیں جو بظاہر معمولی ہیں، شاہ کی دوررس نگاہوں سے پنہاں نہیں رہتیں۔"

جزئیات نگاری، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی منظر کشی اور قدرتی مناظر کی تصویر کشی کا اندازہ کرکے حیران ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے اور گوشے گوشے کا انہیں ادراک ہے اور دنیا کی کوئی شے ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتی۔ وہ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں، اس کے جملہ متعلقات کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ اگر گل و بلبل کا ذکر کرتے ہیں تو موسم کے تار بھی چھیڑ دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں علم فلکیات یا موسمیات کے متعلق سائنسی اصول مروج نہیں تھے۔ دیہات کے لوگ تاروں کے نکلنے، سبزہ زاروں کے آباد ہونے، ہواؤں کے چلنے اور اس نوع کی دوسری نشانیوں سے موسم کا حال معلوم کر لیتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف نے اپنے کلام میں ان تمام قیاس آرائیوں کو دہرایا ہے۔ جو سچ ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے خیال میں موسمی بارشوں کے بعد باد شمال بارش لاتی ہے تو موسم سرما کا آغاز ہو جاتا ہے اور کشتی بان اور بیوپاری اپنی کشتیاں تیار کرنے لگتے ہیں۔ پھر جب مغرب سے ہوائیں چلتی ہیں تو بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ اس موسم میں پھول کھلتے ہیں، پھلوں میں رس بھر جاتا ہے اور زندگی پر نکھار آجاتا ہے اس موسم میں کشتیوں والے واپس آنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے یہ قیافے اور علامات درست ثابت ہوتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں پھلوں، پھولوں اور موسموں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ مروجہ لباسوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ماحول کا لباس پر بھی اثر پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں آج برس ہا برس گزرنے کے بعد سچائی کی مثالیں بن چکی ہیں اور ان کی صداقت نے شاہ عبداللطیف بھٹائی ایسے 'شاعر فطرت' کو مستقبل کے شاعر کی حیثیت بھی بخش دی ہے۔

حسن یار کی باتیں

شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں پرندے بھی ایک کردار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاہ صاحب نے انہیں قاصد کا خطاب دیا ہے۔ وہ ان کا پیغام لے کر محبوب کے پاس جاتے ہیں، مگر انہیں حکم ہے کہ وہ شاہ صاحب کے محبوب کے ہاں مودب ہو کر جائیں۔ شاہ صاحب کا محبوب، محبوب حقیقی ہے جس کے بارے میں وہ قاصد سے کہتے ہیں کہ تمہیں اس کی ارفع و اعلیٰ ذات کی صحیح عظمت کا اندازہ نہیں۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ عاجزی، انکساری اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا کردار ادا کرو۔ شاہ صاحب کے کرداروں کے طور پر لاتعداد پرندے ہیں مثلاً تیتر، تاڑو، کانیرو، مور، ہنس، کوا، کنگ اور کونج وغیرہ۔

شاہ عبداللطیف ان پرندوں، کے ذریعے ستاروں سے بھی رابطہ رکھتے ہیں اور چاند سے بھی۔ اور یہ محبوب حقیقی کے ادنیٰ کرشمے کا مظہر ہیں۔ طاہرہ آغا لکھتی ہیں کہ شاہ صاحب کی شاعری کا خاص پہلو منظر کشی ہے۔ جو صاف اور واضح زبان میں بہت شستگی کے ساتھ ادا ہوتی ہے۔ نخلستان میں برکھا رت کا موسم، سارس کا رنج و غم، جب اس کے ساتھی اس کو تنہا چھوڑ کر پرواز کر گئے ہوں۔ یا شکاری کا حال بھٹکے ہوئے پرندوں کی تاک میں، "تنہائی کے لمحات" جو ایک عورت پر گزرتے ہیں، اس کا محبوب اس کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہو اور وہ لاچار اس دریا کے کنارے جس کو کبھی وہ پار نہ کر سکتی ہو، بیٹھی ہو، مایوس کن، گھنٹوں کے گزرنے کی گھنٹیوں کی آوازیں سن رہی ہو۔ اور اس عالم انتظار میں جب یاسیت کی پرچھائیاں مسلط ہونے لگیں، شاہ عبداللطیف بھٹائی 'کونج' کے سہارے اپنے اور اپنے جذبات کا رخ موڑ لیتے ہیں۔ 'کونج' ان کی ایک مشہور نظم ہے جس کا ترجمہ محترمہ عاصمہ حسین نے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

اجلی اجلی کونجیں، کل ہی کتنے جھرمٹ سے ان کے
اڑ اڑ کے اس دلیس سے جانے کتنی منزل دور گئے

اب کیا اس اتھلے پانی کی گہرائی میں رہنے سے حاصل
اڑ کے گئے جب سارے ساتھی پنکھ ملے اور دل سے دل
اپنی سنگت وہ کب چھوڑیں، کیوں وہ چھوڑیں اپنا ساتھ
ان کے منزل ساتھ ملے ہیں، جیسے باہم بات سے بات
سب جاتے ہیں سنگت میں اس اہل کھلی ٹولی میں!
من میں جتنا پریم ہو، بس اتنا ہی دھن سے بھولا ہی
اتنا ہی رس ہے، اتنی ہی مٹھاس اور اس کا کوئی انت نہیں
کونجیں کونجیں ساتھ رہیں، بھٹکیں نہ سبھوں سے دور کہیں
اپنی قوم سے ہٹ کر رہنا کونجوں کا دستور نہیں
اس سے بڑا ان کا دنیا میں اور کوئی قصور نہیں
ننھی کونج اسے ننھی کونج آواز کو اپنی خوب اٹھا
جیسے بھی بن آئے اس پیغام کو اپنوں تک پہنچا
دن بیتا اور رات آئی - پھر بھیگی رات اور رات گئی
قسمت تیری ٹولی کو اس نیارے دیس میں لائی بھی
لیکن ان کے من میں بسی تھی، بستی جیٹھانوں کی!
اس کی ان کے من میں لگن بھی، اس کی من میں پریت بسی
اس میں کسی کا دوش نہیں ہے، رہ گئی تنہا پھر بھی کیا
اپنا دھنی ہے فکر میں اپنی، آن دے گا تجھے ان داتا
تھی کونج اس فکر میں کل خوب اک بات کا چرچا تھا
دیپ ہے تیری پریت کا ہر ہر ساتھی کے من میں جلتا
پر افسوس! اوجھل ہے تیری آنکھوں سے جال شکاری کا
حال نہیں ہے تجھ پہ روشن خود اپنی لاچاری کا۔!

یہ نظم شروع سے آخر تک (SIMBOLIC) ہے اور اس میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کونج کو محض ایک سمبل بنا کر اشاروں ہی اشاروں میں اخوت و مودت کا درس دیا ہے۔ اس نظم کا مرکز و محور در حقیقت وہ جذبہ اخوت، یکجہتی اور اتحاد ہے جس کا درس حکیم الامت علامہ اقبال نے بھی دیا ہے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

اور بالکل اسی نظریے کا اظہار شاہ عبداللطیف نے اپنے اس شعر میں کیا ہے

اپنی قوموں سے ہٹ کر رہنا، کونجوں کا دستور نہیں
اس سے بڑا ان کی دنیا میں اور کوئی قصور نہیں

ان ہر دو اشعار سے جن کے بین السطور میں ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبہ موجزن ہے مسلم ریاست کا ایک واضح تصور ابھرتا ہے اور قومی اتحاد پر روشنی پڑتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں جہاں 'شاہین' کو سمبل بنا کر اسے پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کا مشورہ دیا۔ وہیں شاہ عبداللطیف نے کونج کے پردے میں ایسی ہی باتیں مختلف رنگ میں کہہ دیں۔ شاہین کے مثل کونج کا سمبل بھی امارت اور محل نشینی کی نفی کرتا ہے۔

ناقدین کی رائے میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے یہ نظم اس وقت کہی جب برصغیر پاک و ہند پر انگریز اپنے اقتدار کے قدم جما رہا تھا۔ اس بات کا اشارہ ان کے اس شعر میں بھی ملتا ہے کہ

پر افسوس! اوجھل ہے تیری آنکھوں سے جال شکاری کا حال نہیں ہے تجھ پہ روشن خود اپنی لاچاری کا۔!

اس نظم سے شاہ صاحب کے سیاسی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ بڑے ہی دھیمے انداز میں صیاد کی چال سے باخبر کر دیتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبداللطیف بہت زیادہ محب وطن تھے۔ وطن کی سرزمین سے انہیں عشق تھا۔ وہ غیر ملکیوں کے تسلط کو گوارا نہ کرتے تھے۔ وطن، ان کا محبوب، ان کی جان اور ان کا ایمان تھا۔ انہوں نے حسن یار کی باتوں میں بھی حب الوطنی کی باتیں کیں۔ کونج کو شاہین کی طرح محو پرواز رہنے کا پیغام دیا۔ یہ پیغام الفت کا بھی ہے اور اخوت کا بھی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کونج ایسے پرندے کا انتخاب کر کے اپنی عالمانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ شاہین کے مقابلے میں اس پرندے میں زیادہ خوبیاں ہیں۔ شاہین اگر تنہا کوہساروں کی جانب محو پرواز ہوتا ہے تو کونج جیسا پرندہ، دریاؤں کے کنارے یا کوہساروں کی سرسبز و شاداب فضاؤں میں بھی کبھی تنہا پرواز نہیں کرتا۔ بلکہ غول کے غول ہوا میں اڑتے ہوئے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ غول، باہمی اتحاد اور ربط و ضبط کو اجاگر کرتے ہیں۔ جس کی مثال علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں موج کو دریا سے تشبیہہ دے کر دی ہے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

کبوتر کی وفاداری اور پیام رسانی اردو شعر و ادب میں اپنا منفرد کردار رکھتی ہے، مگر کونج کی خوبیاں کبوتر سے بھی زیادہ ہیں۔ کبوتر کو تربیت دینا پڑتی ہے اور کونج اس سے مبرا ہوتی ہے۔ اس کی تربیت فطری ہے اور اس کی اجلی اجلی رنگت، صاف شفاف دلوں کے مشابہ ہوتی ہے۔ وہ اڑتی ہے تو اس کی حیثیت محض ایک پرندے کی سی ہوتی ہے اور جب شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کا کردار بن جاتی ہے، تو محبت و یگانگت کا سمبل کہلاتی ہے اسی سے انسانیت اور قومیت کا تصور ابھرتا ہے۔

شاہ عبداللطیف اور امیر خسرو

امیر خسرو اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں جو قدر مشترک ہے وہ ہے "آہنگ" اگرچہ دونوں شاعروں کے دور میں چار سو سال کا طویل فاصلہ ہے، تاہم اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی اور حضرت امیر خسرو، دونوں کو موسیقی سے رغبت تھی۔

امیر خسرو نے پہیلیوں کے ذریعے اصلاح اور علم و حکمت کی باتیں کیں۔ ان کا انداز جداگانہ اور پرکشش تھا۔ ان کا کلام اور شاہ عبداللطیف کا کلام زیر نظر ہو تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دونوں شاعروں کے درمیان کسی نہ کسی حد تک ذہنی وابستگی ضرور ہے اور ان کے ہاں ذہنی میلانات کی علامتیں بھی ملتی ہیں۔ یہ آہنگ اور یہ رچاؤ ایک طرف اگر امیر خسرو کو فارسی شاعری میں ممیز کرتا ہے، تو یہ خوبیاں شاہ عبداللطیف کو بھی دیگر سندھی شعرا کے مقابلے میں بلند ترین مقام پر فائز کر دیتی ہیں۔ اس لیے بلاشبہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاہ کی شاعری اور موسیقی لازم و ملزوم ہیں۔

حضرت امیر خسرو نے ہندوستان کی موسیقی کو فرسودگی اور پابندی سے نجات دلائی، انہوں نے فارسی اور بھاشا میں شاعری کے ساتھ عرب اور فارسی موسیقی کے امتزاج سے ایک ایسی موسیقی ترتیب دی، جو ہندوستانی موسیقی بن سکے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران رہے۔ ان کے اس عمل اور تحریک سے قبل ہندوستانی موسیقی فقط معبدوں میں پرستش کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس موسیقی کا آہنگ بدلا اور اسے عوامی بنا دیا۔ آج بھارتی موسیقی اسی آہنگ کی رہین منت ہے، جو امیر خسرو نے عطا کیا۔ اسی طرح شاہ عبداللطیف نے بھی موسیقی کو اپنی شاعری کا آہنگ قرار دیا۔ امیر خسرو نے تو صرف موسیقی کی ترتیب پر توجہ دی تھی۔ ان کے مقابلے

میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے موسیقی کا سارا اعجاز اور سحر شاعری میں بھر دیا اور ان کی شاعری حساس دلوں کو مسخر کرنے لگی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری کے ذریعے موسیقی کا نیا آہنگ ایجاد کیا۔ انہوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی، جسے عربی اور ہندی موسیقی کا امتزاج کہا جا سکتا ہے یہ امتزاج شاعری اور موسیقی دونوں کے حق میں نیک فال ثابت ہوا۔ اس سے کلاسیکی موسیقی حیات نو سے روشناس ہو گئی اور عوامی موسیقی بن گئی۔ کلاسیکی موسیقی کا اس زمانے میں بڑا شہرہ تھا۔ عوامی موسیقی نے اس شہرت کی جگہ لے لی۔ اسی موسیقی اور غنا کی بدولت شاہ عبداللطیف بھٹائی ایسے عوامی شاعر، جو فطرت کے امین بھی ہیں اور عالمانہ بصیرتوں کے مظہر بھی۔ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

شاعری کا حاصل

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری ذہنی تعیش کا سامان نہیں، بلکہ مقصدیت کا شاہکار ہے۔ اس میں انہوں نے انسانیت مذہب اور معاشرے کے ہر گوشے کو پرکھا ہے۔ ایک سچا شاعر حیات انسانی کا ترجمان اور رہنما ہوتا ہے۔ اسے خواص کی بہ نسبت عوام سے محبت ہوتی ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی ان عوام دوست شاعروں کی صف میں سر فہرست دکھائی دیتے ہیں۔ جو نظریۂ حیات کے داعی اور علمبردار ہیں۔ ہر چند ان کا کلام عارفانہ ہے۔ مگر عارف کامل کی دین اور دنیا، دونوں پر نگاہ ہوتی ہے۔ شاہ عبداللطیف زندگی بھر عوام کی فوز و فلاح کے لیے سوچ بچار کرتے رہے۔ انہوں نے لوگوں کو زندگی کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور انہیں اچھی زندگی گزارنے کی صالح راہ بتائی۔ مسز خمیانی نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "شاہ کے کلام میں قرآنی آیات جگہ جگہ ہیں، مگر ان کا کلام ہندو اور مسلمانوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ در اصل جو شعرا اپنے جذبات کے ساتھ انسانیت کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں وہ سب کے شاعر ہوتے ہیں۔ عقیدے اور مذہب کی کوئی دیوار ان کی مقبولیت میں حائل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ تو انسان اور سماج کے رشتوں کے شاعر ہیں۔ ان کے سامنے تو انسانیت معاشرہ اور تہذیب و تمدن کا ہر گوشہ پیام فکر و نظر بن کر آتا ہے اور اس کے محرکات انہیں دعوت فکر دیتے ہیں۔"

اسی قسم کی رائے کا اظہار میراں محمد شاہ نے بھی کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شاہ لطیف نے اپنے اشعار اور کافیوں کے ذریعے لوگوں کو پیغام دینے کا سادہ، پر اثر اور قابل قبول راستہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے رومانوی قصوں اور محبت کی داستانوں میں سے بعض واقعات پر اپنے کلام کی بنیاد رکھی ہے اور اپنا پیغام ان میں سے کسی خاص کردار کے ذریعے کہلوایا ہے۔ یہ کردار سب کے سب عورتوں کے ہیں۔ شاہ صاحب نے ان رومانی داستانوں کی مکمل کہانیاں پیش نہیں کیں۔ لیکن کچھ اور پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس رومانوی قصہ میں جذب کیا ہوا "زندگی کا مقصد" اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی اسی نظریہ کے قائل تھے، کہ انسان مقصدی زندگی گزارے اور اعلیٰ انسانیت کو فروغ دے۔ شاعری میں مقصدیت کا مفہوم ہمیشہ ارفع و اعلیٰ رہا ہے اور اس مفہوم کی ان گنت مثالیں شاہ صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ جنہوں نے انہیں سید الشعراء بنا دیا۔ وہ ایسے عالمی شعراء میں سے ایک ہیں، جو زمان و مکان کی قید سے آزاد، ملکی حد بندیوں اور قومیت کی سرحدوں سے بہت دور، بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے علمبردار مانے گئے ہیں۔ ان کا ابدی اور ازلی پیغام ہر دور کے لیے پیغام حیات ہے۔ وہ شعراء جو زندگی، انسانیت اور مقصدیت کو اپنا شعار بنا لیں وہ کبھی نہیں مرتے۔ اس اعتبار سے شاہ عبداللطیف بھٹائی ایک لافانی شاعر ہیں۔ اور ان کا کلام آفاقیت کا حامل ہے۔

دیگر زبانوں کے اثرات

انگلستان کے شہرہ آفاق نقاد میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ ادب ماحول کا آئینہ دار ہے اور نہ صرف اس زمانہ کی زندگی اس میں جھلکتی ہے، بلکہ زمانہ ماقبل کے ادبی حقائق اور رجحانات بھی اس پر اثر انداز دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رومیوں نے جب یونان کو فتح کیا تو یونان کے دفاع نے روم کو تسخیر کر لیا۔ اس طرح انگریزی زبان پر عرصہ دراز تک لاطینی اور فرانسیسی ادب کا غلبہ رہا۔ اور انگریز ادبا نے ان زبانوں سے بڑا استفادہ کیا۔ اسی طرح عربوں نے جب ایران فتح کیا، تو فارسی شاعری عربی زبان سے متاثر ہوئی۔ اردو شاعری نے تو ابتدا ہی سے اپنا سارا سرمایہ فارسی شاعری سے حاصل کیا اور بقول حالی یہ فارسی کی چھوٹی بہن ہے۔ تاہم سندھی شاعری بھی اپنے ماحول اور دیگر زبانوں سے متاثر نظر آتی ہے اور سندھی کے مایہ ناز شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری پر عربی، فارسی، بلوچی اور اردو ادب کے اثرات مرتسم معلوم ہوتے ہیں۔ ابن احمد کے بقول :-

> "سندھی زبان میں عربی اثر نسبتاً کم نظر آتا ہے، عربوں نے اس برصغیر پر سب سے پہلا قدم سندھ میں رکھا اور عرب کے نوعمر سپہ سالار محمد بن قاسم نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں سے راجہ داہر کی ٹڈی دل فوج کو شکست دے کر اسلام کا علم سر بلند کیا اور ملتان سے بحیرہ عرب تک ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی، جس کی بنیادیں مذہبی رواداری اور انسانیت پر رکھی گئیں تھوڑے ہی عرصہ میں اس خطہ کی اسلامی سلطنت کا صدر مقام منصورہ اور شمالی شہر ملتان، علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گئے جہاں کے باشندے سکون و فراغت کی زندگی گزارتے تھے۔ شہرہ آفاق مسلمان سیاح ابن بطوطہ، ابن حوقل، ادریسی اور مسعودی، جنہوں نے ان شہروں کو دیکھا ہے، وہ ان کی خوبصورتی، عظمت اور تہذیب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔"

جہاں تک سندھ پر عربی حکومت کے تسلط کا تعلق ہے، وہ تین صدیوں تک رہی۔ بعد میں اس پر پٹھانوں اور مغلوں نے قبضہ کر لیا اور رفتہ رفتہ عربی تہذیب کے اثرات اس خطہ سے زائل ہوتے چلے گئے، مغلوں کے انحطاط کے بعد جب اس خطہ میں سندھی ادب کو عروج ہوا تو شاہ عبداللطیف بھٹائی ایسے شاعر پیدا ہوئے، جنہوں نے دیگر زبانوں کے اسلامی ادب کی طرح سندھی زبان میں بھی حمد و نعت، منقبت اور مرثیے لکھے، جن میں خدا، رسول خدا اور آل رسول کی تعریف کی گئی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں بھی اسلامی عرب سے متعلق وہ تمام رجحانات اور جذبات پائے جاتے ہیں۔ جو دیگر زبانوں کے اسلامی ادب میں موجود ہیں۔ صوفیائے کرام میں غنا کو جو درجہ حاصل ہے، اس سے بھی شاہ لطیف کی شاعری بہت متاثر ہوئی۔ دنیائے اسلام کے مشہور مفکر امام غزالی نے غنا کو خدا تک رسائی کا ذریعہ قرار دیا اور اس قسم کی موسیقی کو جائز سمجھا جس میں جذب کی کیفیت انسان کے لیے معبود حقیقی کی قربت کا باعث ہو، شاہ عبداللطیف بھٹائی بھی اس نظریۂ کے مؤید ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ مثنوی مولانا روم ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی۔ اس مثنوی کو فارسی زبان کا قرآن کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شاہ عبداللطیف بھٹائی فارسی کے مشہور شعراء، جامیؒ، عطارؒ، حافظؒ، سعدیؒ، اور ابو سعید ابوالخیرؒ کے کلام سے بھی متاثر ہوئے۔ ان اثرات نے شاہ عبداللطیف کی شاعری کو گہرا صوفیانہ رنگ عطا کیا۔ ان کے زمانے میں صوفیہ، فقرا،

اور سیدوں کا بڑا زور تھا۔ اور شاہ صاحب کی شاعری نے سندھ کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں طور پر اثر ڈالا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے کافیوں میں ایسا رنگ اختیار کیا جس پر ہر کوئی بلا تخصیص مذہب وجد میں آگیا اور وہ سندھی شاعری کے رومی، عطار اور میر درد کہلائے ایک مشہور نقاد کا قول ہے کہ شاعری زیادہ تر زمانہ جاہلیت میں ترقی کرتی رہی ہے۔ جوں جوں دنیا ترقی کر رہی ہے اور زمانہ میں مادیت پرستی کا رجحان غالب آرہا ہے لوگوں میں تحقیق و تفحص اور تلاش کی عادتیں بڑھ رہی ہیں، جو شاعری کی تخیلاتی دنیا کے لیے مہلک ہیں۔ اس میں تخیلاتی شاعری پروان نہیں چڑھ سکتی اور شاعرانہ تخیل کی بلند پروازیاں بہت محدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مادی تحقیق پرستی سے اس کے راستے مسدود ہو کر رہ جاتے ہیں، یہی سبب ہے کہ زمانہ جدید شیکسپئر اور ملٹن، شیلے، اور کیٹس، ہومر اور ورجل، گوئٹے اور دانتے، عرفی اور فردوسی، حافظ اور سعدی اور غالب اور میر کو دوبارہ جنم دینے سے قاصر ہے۔ یہ شعرا اس دور میں پیدا ہوئے، جب مادیت پرستی نے اس قدر غلبہ حاصل نہیں کیا تھا اور شعرا کے نزدیک تخیل اور مبالغہ آرائی کی لامحدود وسعتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہی حال سندھی شاعری کا بھی ہے اور سندھی زبان و ادب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا سا عظیم شاعر پیدا ہونا مشکل ہی نہیں فی الحال ناممکن بھی ہے۔

ابیاتِ لطیف

صہبائے لطیف

اول الله، عليم، اعليٰ، عالم جو ڌڻي
قادر پنهنجي قدرت سين، قائم آهي قديم
والي، واحد، وحده، رازق، رب، رحيم
سو ساراهه سچو ڙني، جي حمد حڪيم
جڙي پاڻ ڪريم، جوڙون جوڙ جهان جي

وحده لاشريڪ له، جڏهن چيو جن
تن مڃيو محمد ڪارڻي، جيجان ساڙهين
تڏهن مبهمان تن، اڙ ترڪو نه اوليو

وحده لاشريڪ له، بڌجي نه پوتڙا
ڪ ترڪيني نه سا، جي گهٽ اندر گهوڙا
ڳاڻ نيندي گهوتڙ ما، جت ڳاهل ٿيندي ساهو

وحدت جي دريا، الا الله اڏڪيا
محمد سو اجي، مسلمان ٿيا
عاشق عبداللطيف چئي، انهين پهچيا
تيلان ڏٺي ڏما، جيلان ديا وحدت گڏ جي

وحده جي دريا، الا الله سيان اورين
هينون حقيقت گڏيو، طريقت ستو دين
معرفت جي مات سين ڏيساند ڙ درين

سڪ نه ستائي، جين، دليمي نه روڙين
ڪلمون عورين، عاشق عبداللطيف چئي

وحده لاشريڪ له، جان تو چوين ايئن
تان مڃ محمد ڪارڻي، نه تون منجهان نيئن
سو تون وجين عين، نا ايئن ڪنڌ ٻين کي

وحدت تاڪثرت ٿي، ڪثرت وحدت ڪل
حق حقيقي هيڪڙ وه لوني مرميل
هي ڳالهه جو هل، يا الله سنڌ ويهين

ترجمہ

بس وہی اللہ ہے قائم قدیم — مالک الملک، اول و اعلیٰ علیم
والی و رزاق، احد رب الرحیم — اس کو سچا جان، کر حمد حکیم
صانعِ مطلق ہے وہ قادر کریم — اس کی صنعت سے ہے عالم مستقیم

صنعت عالم ہوئی جب استوار — دے دیا احمدؐ کو کل اختیار
جب "انا مولاک" حق نے کہہ دیا — ساتھ اس کے "انت محبوبی" کہا
کہہ دے اے سید کہ بہرِ مصطفیٰؐ — دونوں عالم کو مزین کر دیا !!

مٹ چکے جو وحدہ کی چاہ میں — غرق ہیں وہ ذکر الا اللہ میں
معرفت کی لب پہ ہے مہر سکوت — اک نئے عالم کا دیتے ہیں ثبوت
مستعد ہیں چین سے سوتے نہیں — وقت کو آرام میں کھوتے نہیں
اے لطیف اس ڈھب کے جو عشاق تھے — ان کے سر شانوں سے اکثر کٹ گئے
کٹ چلے جو "وحدہ" کی چاہ سے — ہو گئے دو نیم "الا اللہ" سے !
ان کے ہونٹوں سے یہی نکلی صدا — ہیں رسولِ حق محمد مصطفیٰؐ
ان کے دل جب محوِ ایماں ہو گئے — تب سے وہ کامل مسلماں ہو گئے
گامزن اس رہ پہ جو عشاق ہیں — اے لطیف اس کے وہی مصداق ہیں
کر دیا مالک نے اس کو صاف دل — ہو گئے وحدت میں شامل مستقل

کثرت از وحدت ز وحدت کثرت است — وحدت اندر وحدت اندر وحدت است
بھول مت، وہ درحقیقت ایک ہے — ایک ہے، ہر فعل اس کا نیک ہے
سب میں ہے مظہر اسی محبوب کا — شور ہے واللہ اس مطلوب کا

لاکھ دروازوں کا قصر پرسماں — اور ہر جانب کروڑوں کھڑکیاں
جس طرف بھی دیکھتا ہوں سربسر — اس طرف آتا ہے، وہ مالک نظر

(رشید احمد لاشاری)

موج در موج

ساهڙ ساميٺي، ساڻ ڀيٽ سويٺي
آهي بخوئي گهمبه گهبجاندڙ گالهڙ ي

عاشق وہی ہے، معشوق بھی وہ اور دیا بھی وہی۔ درحقیقت تینوں ایک
ہی چیز ہیں۔ یہ ایک اہم راز ہے۔

چواوجيي چاعاڻ هت نه ڳولهين هي دت ڪي
لطيف چئي ٻاروچو ٻيءَ پار !!
پاڻ نيٺ نهار، ته تو ميه ديد دوست جو
تمہارا محبوب تم سے دور نہیں ہے۔
تم اسے خوامخواہ تلاش کر رہے ہو۔
دور دور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

جان جان پيئين پاڻ کي، تان تان نا ٿا نماز
سڀ وڃائي ساز، تنهان پوءِ تڪبير چئو
جب تک تم میں خودی ہے، تمہاری نماز ناقبول ہے۔
پہلے اپنی خودی کو ختم کرو، تب تکبیر کہو۔

ان پر نه ايمان، جي ڪلمه گو ڪو ٿئين
دغا تنهنجي دل ۾، شرڪ ۽ شيطان
منهن هيه مسلمان، اندر آذر آهين
میں صرف زبان سے کلمہ سن کر تم پر یقین نہیں کر سکتا۔
اس لیے کہ تمہارے دل میں دغا، شرک اور شیطان ہے۔
تم بظاہر درویش لگتے ہو، لیکن تمہارے دل میں آذر موجود ہے

ساري رات سبحان، سائين جنهين ياد ڪيو
ان جي عبدالطيف چئي لڌ ومان
ڪوڙين ڪن سلام، آستڻ اچيوان جي
جو درویش اللہ کی یاد میں راتیں جاگ کر گزارتے ہیں
ان کے مزار کو بھی عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے۔
لوگ وہاں کروڑوں کی تعداد میں سلام کرنے آتے ہیں

جي تون بيت ڀانئين، سي آيتون آهين
نيو من لائين، پريان سندي پار ڏي
جن کو تم ابیات سمجھتے ہو، وہ درحقیقت آیات ہیں
اس لیے کہ وہ روح کو دوست (خدا) کی طرف لے جاتے ہیں۔

مونکي مون پرين ٻڌي وڌو وهاءِ ۾ !
متان ائين چون، متان پانڌ پسائين پنهنجو
میرے محبوب نے مجھے مضبوطی سے باندھ کر دریا میں پھینک دیا۔
اور حکم دیا کہ پانی میں اپنے دامن کو تر نہ کر۔

ڪين ماپندا هن ۾، خودي ۽ خدا !!
هن تراڙين جا ڳڪا، آهي هڪميانءَ ۾
ایک ہی دل میں خدا اور انسان کی اپنی انا نہیں سما سکتی۔

عشق نه آهي ساند، جئين ڪيڏن ٿا ٻيڊو
جيءُ جسو ۽ جان، جي ڀيي ڇڏ ڪباند
سسي نيڏي پاند، اچل ته ته اڙ ٿيءُ
عشق کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ اس میں جسم، جان اور روح
کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ اگر تم واقعی سچے عاشق ہو تو اپنے سر
کو نیزے پر پھینکو، تاکہ ذرہ ذرہ ہو جائے۔ اور لوگ دیکھ سکیں

سسّی پنّوں

سندھ کی اس عوامی داستان کو شاہ عبداللطیف بھٹائی نے حسن و عشق اور معرفت کے رنگ میں بڑے دلکش پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ یہ داستان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ منظوم سندھی داستان کے چند اشعار اور ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

مليس جهل مهار، ڪيئن ڪاهم ڪرهو
ساجن تو هان ڌار، ڏلم ڏينهن تيامر جو
بے بس ہو گئی ہوں اونٹ کی باگ کھینچ کر اسے روکے
اے دوست تمہارے بغیر مجھ پر قیامت گزر گئی۔

ڏاگهن، ڏيون، ڏونگرن، تنهين ڏک ڏنام
اکين لوما ٻيو هينئون، ڇين پير ڇپنا هر
رنديون رت رنام، پرندي يار پنهون جي
اونٹوں، دیواروں اور پہاڑوں تینوں نے ستایا ہے لوگوں
نے جھلس ڈالا ہے پتھروں نے پیر زخمی کر دیے ہیں۔ رستوں
نے خون کے آنسو رلائے ہیں، پنوں کی طرف جلتے ہوئے

ڪيچان آيو قافلو، عطر آندا اٿرن
ڪڏوري خوشبوءِ سڀن وڻ ٽڻ واسيا اُٿ
خيما کوڙ ياتون، وريو بخت ڀنڀو ر جو
کیچ سے قافلہ آیا ہے، عطر لایا ہے۔ مشک کی خوشبو سے
درخت پودے سب معطر ہو گئے ہیں۔ خیمے لگ گئے ہیں بھنبور
کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔

ڪيچان آيو قافلو، ساڻ ڌڻي سرواڻ
وارڊري ڏاگو ڏڪ وياز، پسان هوند پلاڻ
جهڙ و پنهون پاڻ، تهڙي ساٿ اٿ جي
کیچ سے قافلہ آیا ہے اور قافلے کا سردار ساتھ ہے۔

جی چاہتا ہے کہ بال کاٹ کر مہار بناؤں اور کاٹھی ڈالوں جیسا
بنوں خود سجیلا ہے، ویسے ہی اس کے ساتھی ہیں۔

کيچان آيو قافلو، طرح مرجاري توڙ
سينگاريا ثون سيد چئي، کرهانجهان ڪوڏ
لڪ لڪي ٿي لوڏ، جيجان تن جتن جي

کیچ سے قافلہ آیا ہے اور اس میں خوبصورت اونٹ ہیں۔
سید کہتے ہیں کہ اونٹوں کو پیار سے سجایا گیا ہے۔ اور پھر
اونٹ والوں کا لہرا لہرا کر چلنا قیامت ڈھا رہا ہے۔

ڪيچان آيو قافلو، جنگ سونهاري جوڙ
تلپارا توڙن کي، گيچي سونهن موڙ
دولت چايان دوڙ، جي مون نين پاڻ سين

کیچ سے قافلہ آیا ہے، بڑا دلفریب انداز ہے۔
ساز و سامان خوبصورت اور گلے میں ہار اگر وہ مجھے ساتھ
لے جائیں تو میں اپنا سب کچھ قربان کر دوں

ڪرڙ ڏونگر، ڪهه گهڻي، جت برپٽ برپان
ڏاهن ڏاهپ وسري، تيا حريف ٿي حيران

سب پہاڑوں میں چلنے کی سخت تکلیف اور پھر ویران لق ودق صحرا
ایسے میں عقلمندوں کی بھی عقل ماری جاتی ہے اور پریشان ہوجاتے ہیں۔

ڪرڙ ڏونگر، ڪهه، گهڻي، جت واٽن تي وادي
آڙالڪ لطيف چئي سر سڄڻ ٻاري
جا منزلن ماري، ما قادر ڪيچ وسائين

پہاڑوں کی یہ سنگلاخ سرزمین میرا راہ روک رہی ہے۔
اے میرے محبوب لطیف کی صدا سن اور جلدی آجا۔ میں
منزل پر پہنچتے پہنچتے تھک گئی ہوں۔ اے مالک میری فریاد سن۔

لخت لخت

(چند منتخب ابیات اور وائیوں کا منظوم اردو ترجمہ)

(۱)

اول خدا علیم، اعلیٰ عالم کا ولی
قادر اپنی قدرت سے، قائم خود ہے قدیم
مالک مولیٰ لاشریک، رب رحمان رحیم
کرکے کرم کریم نے، پیدا کیا جہان کو

(۲)

پیدا کیا جہان کو، جس لمحے جس آن
مالک محمد کو کیا جس کی اعلیٰ شان
کلمہ دل میں کریم کا، ظاہر کرکے زبان
انا مولاک وانت محبوبی، اس کا نام نشان
دونوں ایک سمان، محبت سے پیدا کیے!

(۳)

پیدا کیا انسان کو، عالم ہژدہ ہزار
حامی ہادی ہاشمی، سرور اور سردار
وہ صحبت سرکار کی، وہ اصحاب کبار
چیدہ چاروں یار وہ، حرم میں جیسے

(۴)

وحدہ لاشریک لہ، ہر دم لب پہ آئے
سنت واجب فرض کچھ، قضا نہ ہونے پائے
توبہ کی تسبیح پڑھو، جو دل کا روگ مٹائے
خاص اس کی یاد سے، کوئی سانس نہ جائے
دل والو! محبوب کو، دل میں رکھو بسائے
چاہے جی کو جلائے، دوزخ جیسی آگ بھی

(۵)

وحدہ لاشریک لہ، جس نے کیا اظہار
اس کو مقام محمدی کی۔ منزل نہیں دشوار
سر کی نذر گذار، جھکا نہ آگے غیر کے

(۶)

وحدہ لاشریک لہ، انس و جن کا کلام
دل سے مقام محمدی، فاصلہ یک گام
ساحل ہے الزام، دل دریا میں ڈوب جا

(۷)

وحدہ لاشریک لہ، ہے جس کا ایمان
صرف مقام محمدی، اس کے قلب لسان
حق کا ہے فرمان، دل کا دریا پار کر!

(۸)

بس ان کی خوراک، عاشق خوش ہیں زہر سے
سخت ان کا مجرب ہے، قاتل اور سفاک
ایسوں کو لطیف کیا، سوز جگر نے خاک
دل میں ان کے چاک، لب پہ لیکن آہ نہیں

(۹)

پیارے ضبط عشق کی، سیکھ آئے سے آن
چاہے جائے جان، پر آنچ نہ نکلے!!

(۱۰)

دشت وفا سنسان ہے، اہل طلب میدان
ایک کو دیکھے تمیں جو، وہ ہے اصل نادان
کس کو ہے عرفان، وحدت ہے کثرت نہیں

(۱۱)
گونج اور آواز، ایک اصل دو روپ ہیں
جو پائے یہ راز، اس کو عارف جانیے

(۱۲)
ایک قصر در سینکڑوں، دریچے ہزار
دلبر کا دیدار، ہر ہر پل ہر ہر گھڑی

(۱۳)
آ بس لمحے چند، پیارے آنکھوں میں بھری
کروں آنکھیں بند، میں دیکھوں نہ دیکھے کوئی

(۱۴)
برسیں ساری رات، بادل چھائیں صبح سے
دل میں یاد سجن کی، آنکھوں میں برسات
کب ہوگی پربھات، جھڑی نہ پل بھر کو رکے

(۱۵)
گھٹا گھری گھنگور، جل تھل ہوں سگے ایک ہے
ایک سما برسات کا، ہوگا چاروں اور
بادل استنبول سے، اٹھے ہیں کرتے شور
تڑپی بجلی چین پر، سمرقند چمکار!
گھٹا چلی ہے روم سے کابل اور قندھار!!!
چھائی دلی دکھن پر، پہنچی تا گرنار!!
جیسلمیر پہ برس کر، بیکانیر کیا پار
کچھ بھج پہ آکر ہوئی، بارش کی بھرمار
ڈھٹ سے عمر کوٹ تک، ہوا موسلا دھار
کرم سدا کر سندھ پر، بڑی تری سرکار
جگ کے پالن ہار، کر آباد سنسار

(۱۶)
ناقہ ناقے والے دشمن، دیو رلیں کی کہاں
بیری بن کی تیز ہوا ہے، مٹے قدم کے نشان
سورج پاپی ڈوب گیا ہے، ہے تاریک جہان
راہ میں بیری جبل کھڑا ہے، کیسے ملے امان
چاند اندھیری رات میں گم ہے، بچ نہیں سکتی جان
رو رو ہوئی ہلکان، بن میں ماری پریت کی

(۱۷)
تم حاتم داتار ہو، میں مسکیں محتاج
بگڑے مرے کاج، میں فولاد یارس تجے
چھو کر مجھ کو آج، سونے میں تبدیل کر

(۱۸)
تھا وہ سما خوب، مجھ کو ندی میں ڈال کر
ساحل سے محبوب بولا، دامن تر نہ ہو!
زخمی ہو ناسطے کرسے، کٹ کر کرسے پکار

اپنوں سے بچھڑے تو وہ روئے زار قطار

سانحہ کربلا

محرم کا مہینہ۔ ہر اسلامی سال کے آغاز میں کئی دلگداز، روح فرسا، درد انگیز اور رقت آمیز یادوں کو لے کر آتا ہے۔ اسی مہینہ کی ۱۰ تاریخ کو حضرت امام حسینؓ شہید ہوئے۔ سانحہ کربلا، اسی شہادت عظمیٰ کے واقعات دہراتا ہوا خون کے آنسو رلاتا ہے۔ یکم محرم سے ۱۰ محرم الحرام تک قافلہ حسینی پر کیا بیتی؟ اس تاریخ کا ورق ورق لہو لہو ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے "مرثیہ شہادت" کو جس رقت انگیز انداز میں سانحہ کربلا کے عنوان سے لکھا، وہ پڑھنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مرثیہ شہادت کو سن کر دل تڑپنے لگتا ہے۔ رئیس امروہوی نے اس سانحہ کربلا کا آزاد اردو ترجمہ و تضمین کی ہے۔

یہی تقدیر یزداں تھی، یہی سر مشیت تھا
مدینے اور مکے میں بپا شور قیامت تھا
یہی فدیہ برائے بخشش افراد ملت تھا
شہادت کربلا والوں کی کیا تھی؟ راز قدرت تھا
محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے

مدینہ سے گئے وہ کربلا کی قتل گاہوں میں
وہ خونیں قتل گاہیں آج تک فریاد کرتی ہیں
حسینی قافلہ، صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا
وہ راہیں آج بھی اس قافلے کو یاد کرتی ہیں
یہ منظر پھر کہاں اہل مدینہ کو نظر آیا!
مدینہ کا مسافر کب مدینے لوٹ کر آیا
محرم آگیا، اُمت کے شہزادے نہیں آئے

مجھے، اے رنگ ریز! اٹھ اور رخت ماتمی پہنا
کہ ملبوس سیہ اک آئینہ ہے جذبہ غم کا
سیہ ملبوس پہنا دے کہ ماتم دار مولا ہوں
نشاں ہے یہ شہیدان وفا کے رنج و ماتم کا
محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے

شہادت کیا ہے؟ اک ورثہ محمدؐ کے گھرانے کا
کوئی شکوہ نہ تھا مولا کو اعدا کے ستانے کا
شہادت ان کی وجہ ناز وہ ناز شہادت تھے
نیا عنوان تھے وہ حق و باطل کے فسانے کا
شہید عشق ہی واقف ہے اسرار شہادت سے
وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا
محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے

ہوئی جب رخصت اہل حرم شہر مدینہ سے
فلک پہ تیرگی، ماحول پہ حسرت برستی تھی
رسول اللہؐ کے روضہ میں تھا ہنگامہ ماتم

سکوں کے واسطے خود فطرتِ مضطر ترستی تھی

نوحہ

فریاد ہر سو تھی کہ اے وائے مدینہ　اس شہر سے ہے رخصت مولائے مدینہ
افسوس یہ بستی ہوئی سادات سے خالی　کس واسطے ویراں نہ ہو دنیائے مدینہ
شبیرؑ ہوئے گامزن راہ شہادت　تکبیر بہ لب، دل میں تمنائے مدینہ

محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے

چلے شعبان میں مقتل کی جانب کربلا والے
نکلے تھے نرالی شان سے صبر و رضا والے
انہیں خود ناز تھا، اپنی شجاعت پر شرافت پہ
یہی تھے مصطفےٰ والے، یہی تھے مرتضےٰ والے
مدینے سے چلے تھے، امتحاں گاہ مصائب کو
جہاد فی سبیل اللہ کی دھن میں خدا والے

خیام اہلبیت مصطفےٰ تھے خاک کے اوپر
ادھر اک حشر سا تھا گنبد افلاک کے اوپر
حسینی فوج کتنی مختصر اس کے مقابل میں؟
مگر دہشت تھی اس کی لشکرِ ناپاک کے اوپر

مصائب تھے مگر حضرت نے ماتھے پر نہ بل ڈالا
شجاعت سے نظام زندگی سارا بدل ڈالا
شکستِ ظاہری "فتح مبین عشق" ہوتی ہے
حسینی فوج نے باطل کی قوت کو کچل ڈالا

شہیدان وفا جب گھر گئے باطل کے نرغے میں
تو دہشت جنگ میں یہ قول تھا انصار حضرت میں
لیا کرتا ہے محبوب حقیقی امتحاں یوں ہی
ہمیشہ اولیاء اللہ کے صبر و اطاعت کا

نوحہ

جب سبط پیمبر قتل ہوئے تھا شور قیامت واویلا　اے کشتۂ حسرت واویلا، اے ندبۂ امت واویلا
سادات نے اپنی جاں دے کر تکمیل کی عہد اول کی　خود لوح و قلم میں کندہ تھی مولا کی شہادت واویلا
اس حادثۂ غمناک پہ تھے خود جن و ملک بھی گریہ کناں　جن کیا کہ پیمبر روتے تھے اللہ رے مصیبت واویلا

محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے

جہاد کربلا کو بھول سکتا ہی نہیں کوئی
جہاد کربلا کیا؟ کارنامہ عشق و عرفاں کا
زمانے میں ہزاروں معرکے برپا ہوئے اب تک
مگر یہ معرکہ اک نقش تھا تقدیر یزداں کا

ادھر تھے شہسواران مدینہ پشت مرکب پر
ادھر انبوہ تھا، ان کے مقابل، اہل عصیاں کا
رجز، نعرے، تلاطم کشمکش، نیزہ زنی حملے
یہ کیا تھا؟ امتحان عشق تھا، کچھ اہل ایماں کا

فقط اک تشنہ لب کے واسطے اعدا کے لشکر سے
وہ پیہم تیر کی بارش، وہ تلواروں کی جھنکاریں
وہ جذبہ، اللہ اللہ کربلا والوں کا وہ جذبہ
تن زخمی سے ان کے خون کی بہتی ہوئی دھاریں
سپاہ مختصر کے واسطے وہ شام کے لشکر
گلوئے خشک مولا کے لیے وہ تیز تلواریں

وہ دہشتِ جنگ تھرآیا وہ قرنا کی صدا گونجی
اسی صورت بہادر جنگ میں جیتے ہیں مرتے ہیں
جو ایسے معرکوں میں شہسواروں پر گزرتی ہے
جری رہوار خود بھی معرکوں میں کر گزرتے ہیں

اگرچہ کوئی انصار و اعزا میں نہ باقی تھا
حسینؓ ابن علیؓ میداں میں آئے یا علیؓ کہہ کر
فضائے کربلا پہ اک سکوتِ یاس طاری تھا
مگر خیموں سے رونے کی صدا آتی تھی رہ رہ کر

ادھر سیدانیاں بچوں کو اذن جنگ دیتی تھیں
کہ دیکھو موت کے میدان خوں میں نہ گھبرانا
ادھر دشمن کی مستورات خود دشمن سے کہتی تھیں
کہ تم ان کے جگوڑے ہو، تمھیں لازم تھا مر جانا

نوحہ

وہ حسینؓ اور وہ ان کا صبر جلی　یا علیؓ، یا علیؓ، یا علیؓ، یا علیؓ
جس پہ نوحہ کناں سارے اہل جہاں　وہ ولی، وہ ولی، وہ ولی، وہ ولی

یہ کیسی شبنم افشانی، گگن ہے جس پہ اشکوں کا
بہار ایسی کہ جو گلزار زہرا کو نہ راس آئی
یزید! آل نبی سے ختم کر دے کشمکش اپنی
دگرنہ تیری قسمت ہے بروز حشر رسوائی
نجانے کوفیانِ بے وفا کا حشر کیا ہوگا
کہ ایسی بے وفائی اور بخشش کے تمنائی
شہید کربلا کو خط لکھے، کوفہ میں بلوایا
مگر جب آگئے، تو بیکسوں سے رزم آرائی

قصہ کبوتر

وہ دشتِ بلا، وہ غضب کا سماں — وہ مظلوم کا لاشۂ خوں چکاں
نہ ہمدم، نہ حامی، نہ یاور کوئی — مگر اڑ کے آیا، کبوتر کوئی
وہ سیّد کے لاشے سے رو کر اڑا — پر و بال خوں میں بھگو کر اڑا
چلا جانبِ روضۂ مصطفٰےؐ — وہی قاصدِ کشتۂ کربلا
کبوتر، شہیدوں کا پیغام بر — پر و بال تھے خوں میں تر بتر
فرشتے جہاں، مائلِ اعتکاف — وہاں وہ کبوتر تھا محوِ طواف
نواسے کی دردآفریں موت کا — کبوتر نے نانا کو پُرسا دیا

حسینؑ اے خوشا نام نامی تیرا
کبوتر تھا، پہلا پیامی ترا

محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے
حسنؓ ان کی مدد کو سے تھے نہ حیدرؓ جلوہ فرما تھے
مقامِ امتحاں میں حضرت شبیرؓ تنہا تھے
حسنؓ ہوتے تو وہ بھی کربلا میں جان دے دیتے
کہ یہ دونوں برادر، عاشقانِ حق تعالیٰ تھے

وہ دشتِ کربلا، وہ مشہدِ مولا کا نظارہ
تنِ اطہر لہو میں غرق اور دستار صد پارہ
سجودِ شکر سے لوحِ جبیں پر مہرِ نورانی
جراحت ہائے سینہ سے ابلتا خون کا دھارا
صفائی فاطمہ زہراؓ نے کی تھی شہ کے مقتل کی
علی ابن ابی طالبؓ تھے خود میداں میں صف آرا

ہزاروں نیم جاں لاشیں پڑی تھیں اس بیاباں میں
لہو سے لال تھے دلدل کے سم، خونریز طوفاں میں
شفق آلودہ گردوں، خون رلاتا تھا غریبوں پر
زمیں کو زلزلہ سا تھا، غمِ شاہِ شہیداں میں
حسینؓ ابن علیؓ نے عہد ایفا کر دیا اپنا
وہ ظاہر ہو گیا مخفی تھا جو تقدیرِ یزداں میں

نوحہ

شہید مقتلِ صبر و رضا کا ماتم ہے — قتیلِ معرکۂ کربلا کا ماتم ہے
جسے ملا نہ تہِ تیغ بوند بھر پانی — فغاں کرو، یہ اسی بے نوا کا ماتم ہے
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا جس نے — خدا گواہ، اسی باخدا کا ماتم ہے

محرم آگیا، امت کے شہزادے نہیں آئے
عجب انداز سے میداں میں حرؓ نامور آئے
یہ شوقِ سرفروشی تھا لیے ہاتھوں پہ سر آئے
کہا حرؓ نے کہ مولا جاں نثاری کی تمنا ہے
یہی دل کا تقاضا تھا جو رن میں کھینچ لایا ہے
وہ غازی سر بکف ہو کر گھسا پھر فوجِ اعدا میں
بالآخر حرؓ نے اپنی جان دے دی راہِ مولا میں

حسینؓ اللہ اکبر، اے حسینؓ اے کربلا والے
سبق لیں تجھ سے ایثار و شجاعت کا وفا والے
لگے تھے زخم جو سر پہ، تری دستار پُرخوں تھی
تری ریشِ مبارک خون کے قطروں سے گلگوں تھی
دُرِ دنداں ترے گلنار کی صورت چمکتے تھے
خجل تھا بدرِ کامل رخ پہ وہ جلوے جھلکتے تھے

بروزِ حشر جب دربارِ حق آراستہ ہوگا
محمد مصطفٰےؐ کے ساتھ ہر اہلِ وفا ہوگا
حسینؓ ابن علیؓ بھی رونقِ روزِ جزا ہونگے
گنہ گارانِ امت کا وہی تو آسرا ہونگے

وہ فقط آب و دانہ، کربلا کے دشتِ غربت میں
وہ دس دن اور نو راتیں رہے کیسی مصیبت میں؟
انہیں کب موت سے کھٹکا تھا کب پروائے لشکر تھی
شہادت ان کی قسمت تھی، اجل ان کا مقدر تھی
ارے او کرگس خونخوار، کیوں آنکھیں دکھاتا ہے
شہیدوں کی یہ لاشیں ہیں یہاں کیوں پھر پھیرا تا ہے

جہاں میں تین طبقے شبر و شبیر پر روئے
گھروں میں آدمی، دشت و جبل میں جانور روئے
فرشتے تھے فلک پر، ماتمِ شاہِ شہیداں میں
گئے شہزادگانِ خلد، جنت کے گلستاں میں
تہی ہیں جن کے سینے آپ کے دردِ شہادت سے
شفاعت کی نہ رکھیں وہ کوئی امید رحمت سے

نوحہ

اٹھو، غم رسیدوں کا ماتم کرو — خدارا شہیدوں کا ماتم کرو
اٹھو، فخرِ امت کا ماتم کرو — قتیلِ صداقت کا ماتم کرو

بہاتے نہیں کس لیے اشکِ غم — نہیں آنکھ کیوں ماتمِ شہ میں نم
اٹھو، تشنہ کاموں کا ماتم کرو
تم اپنے اماموں کا ماتم کرو

دائیٔ

ہوگا وہی طبیب مرے دل کے درد کا
چارہ سوزِ ہجر کا ہے وہ دلا رحبیب
ہوگا وہی طبیب مرے دل کے درد کا
دکھیا سے وہ آملے ایسے کہاں نصیب
ہوگا وہی طبیب مرے دل کے درد کا
حاذق حکیم لطیف کے کب ہو دل قریب
ہوگا وہی طبیب میرے دل کے درد کا
(ترجمہ الیاس عشقی)

آتشِ عشق

بے چینی سے لوٹ رہے ہیں
عشق کی آگ میں جلنے والے   لب پہ مسلسل آہیں نالے
رو ریں رو ریں میں آگ لگی ہے   رگ رگ جل کر راکھ ہوئی ہے
انگ انگ میں کرب جلن کا   ایک ہی عالم ہے تن من کا
دیکھ اگر ہے تاب نظارا   آتشِ عشق کا کھو لتا دھارا
دہکے ہولوں کے انگارے
یا تیکھے کانٹوں کی سیخیں
ان پہ تپے گر تن من میرا
کیا میں ان سے منہ موڑوں گا!
پروانوں سے جا کر پوچھو!
کیا لذت جل جانے میں ہے
کیوں جلتے ہیں، کیوں مرتے ہیں
یوں بڑھ بڑھ کے یہ متوالے
عشق کا تیر لگا ہے کاری   جیون پر ہے پل پل بھاری
شمع کی لو پر وار کے تن من   دم لیں گے یوں ہی دیوانے
بے چینی سے لوٹ رہے ہیں
عشق کی آگ میں جلنے والے
لب پہ مسلسل آہیں نالے
(ترجمہ جمیل نقوی)

جمالِ ناز

مہرباں، مہرباں، شگفتہ جبیں   میرے آنگن میں آتا ہے پیارا مرا
اس سے بڑھ کے ہے میرا وہ مہر جبیں   چاند اچھا سہی چودھویں رات کا

میرے در پہ ہے لوگوں کی منڈلی کھڑی   میرے پیارے کی سب لوگ باتیں کریں
میرے گھر میں تو ہے آج اتری خوشی   جن کو جلنا ہے، جلتے ہیں، جلتے رہیں

سینکڑوں مہر ہوں بیسیوں ماہ ہوں   مجھ کو سوگند اللہ کے نام کی!
ان کے ٹکڑے بنا منزلوں منزلوں   رات ہی رات مجھ کو نظر آئے گی
کتنا کم ارزدے ہیچ ہے چاند تو   شب کو آئے نظر، شب کو چمکا کرے
میرے پیارے کے آگے بھتا ہے تو   دائمی ہیں اجالے مرے دوست کے

صبح دم اٹھ کے محبوب کے کان میں   یہ سندیسہ ہمارا سنانا سجن
"تجھ پہ ہم عمر دو دل کی ہیں آنکھیں لگی
دیکھ ہم کو نہیں بھول جانا سجن"
(ترجمہ ابن انشا)

چارہ گری

جب درد نہ دل میں سر اٹھائے   کیا کرنے کو چارہ ساز آئے
دل تو غمِ عشق سے تہی ہے   پھر بھی تجھے آرزو لگی ہے
آکر کوئی سحر آزمائے   درماں گرے درد آشنا تے

لینا اسے جان پر مری جان   جو کچھ بھی ہو چارہ گر کا فرماں
ہمت کبھی ہاتھ سے نہ جائے   شکوہ نہ یہ تیرے لب پہ آئے
"ان لوگوں نے جانے کیا کیا ہے   یاروں کو ہم سے جدا کیا ہے
کتنا کہ بھلا کیا انھوں نے   یاروں کو ملا دیا انھوں نے"
میرے کہے، صبر آزما کے   فرصت ہو تو سوچ سر جھکا کے
یہ غیظ و غضب بری بلا ہے   ہاں صبر و رضا میں اک مزا ہے
جن لوگوں کا کیش ہے صبوری   ہوتی ہے انہیں کی بات پوری
نخوت کو ہمیشہ خوار دیکھا   سرکش کو بحالِ زار دیکھا

جو لوگ ہیں عاجز و رمیدہ   ہیں بار شکیب ناچشیدہ
اپنے پہ نہ پا سکا جو قابو   اس کا یہ مآل جان لے تو
ہوتا ہے وہ ایک دن پشیماں   پاتا ہے سزائے ناسزایاں
دیکھے وہ دماغ کتنا عالی
جھولی رہے کینہ ور کی خالی
(ترجمہ ابن انشا)

شعلۂ بے دود

دل ہے وابستہ غمِ محبوب
عالمِ جذب و شوق لامحدود
ہے گرانبار عشق کی زنجیر
جنبشِ پائے ناتواں بے سود
ہر تمنا جراحت صد چاک
آرزو ایک شعلۂ بے دود!!

بحرِ غم اور سیلِ اشک رواں
موج در موج گوہرِ مقصود
(ترجمہ :- رشید احمد لاشاری)

کیچ ہے کتنی دور . . .

کون بتائے کیچ پنوں کا دیس ہے کتنی دور
اللہ میاں ! کیچ ہے کتنی دور

ناقہ ننگے والے دشمن، بیری ریگستان
قدم قدم پر خطرہ لاحق اور اکیلی جان
کیسے ہو گھر، دکھیاری سے کوہستان عبور
کون بتائے کیچ پنوں کا دیس ہے کتنی دور
اللہ میاں ! کیچ ہے کتنی دور

دل کی دولت سو کے گنوائی کس کو دوں الزام
جانے ان آنکھوں پہ رہے گی کب تک نیند حرام
کیا کیا باتیں سوچ کے اب دل ہوتا ہے رنجور
کون بتائے کیچ پنوں کا دیس ہے کتنی دور!
اللہ میاں ! کیچ ہے کتنی دور

دل کی دنیا سونی سونی، اجڑا دیس بھنبور
اب نہ ٹھکانہ کوئی سسی کا اور نہ کوئی ٹھور
جنم کی سکھیاں بچھڑ رہی ہیں دل سے ہوں مجبور
کون بتائے کیچ پنوں کا دیس ہے کتنی دور
اللہ میاں ! کیچ ہے کتنی دور

بس چلتا تو جا کے بجھاتی ان آنکھوں کی پیاس
ہوتے پنوں تو پوری ہوتی پیا ملن کی آس
اب تو ہوں تقدیر کے ہاتھوں بے بس اور مغموم
کون بتائے کیچ پنوں کا دیس ہے کتنی دور!
اللہ میاں ! کیچ ہے کتنی دور
(ترجمہ الیاس عشقی)

نغمہ جانفزا

گھڑا ٹوٹا تو یہ آواز آئی نہیں دونوں میں اب کوئی جدائی
وجودِ زندگی میں نغمہ زن ہے رباب روح کی نغمہ سرائی
وصالِ یار کی راحت پہ قرباں
ثوابِ زہد و رسمِ پارسائی
سوہنی کیا تھی اور کیا مہینوال راز سربستہ ہی رہی یہ بات
فہم و ادراک کی رسائی کیا عشق ہے ماورائے امکانات
یادِ عہدِ ازل رہا اس کو زندگی بھر وفا پرست رہی
پیارے مہینوال کی محبت میں!
سوہنی سرخوشِ الست رہی

بحر و بر ہی پہ کچھ نہیں موقوف ساری دنیا ہے حسن سے معمور
کار فرما ہے اے مرے محبوب فرش سے تا بہ عرش تیرا نور
خیر ہو دادرو گیر کی یا رب
ذرہ ذرہ ہے پیرو منصور
گھڑا کچا میں تنہا اور چھائے برستی رات کے گھنگھور سائے
فضا ایسی کہ جیسے شیر کوئی کہیں بیٹھا ہوا اپنا سر اٹھائے
سہارا دے مجھے اے جوشِ الفت کمی تیری تمنا میں نہ آئے
نڈر ہو کے میں اب دریا میں کود دوں
بلا سے جان جاتی ہے تو جائے!!
(ترجمہ شیخ ایاز)

عمر ماروی

ماروی ملیر گاؤں کے ایک غریب گلہ بان کی لڑکی تھی جس کی نسبت اپنے ہی قبیلہ ملوک کے ایک نوجوان سے ہو چکی تھی۔ لیکن عمر کوٹ کا راجہ سمرہ ایک شخص کے بہکانے سے اسے اٹھا لے گیا تاکہ اسے اپنے محل میں داخل کرے وہاں اس نے ماروی کو ایک دو منزلہ مکان میں بند کر دیا مگر وہ وفا شعار وہاں ثابت قدم رہی۔ اس نے عمر سمرہ کو دھمکی دی کہ تم فریب دینے کی کوشش کروگے تو میں خودکشی کر لوں گی، آخر یہ طے پایا کہ اگر بارہ مہینے کے اندر اندر اس کے عزیزوں نے اسے آکر چھڑا لیا تو ٹھیک ورنہ ماروی کو عمر سے شادی کرنا پڑے گی۔ وہ اس بالاخانہ میں سال بھر بند رہی اور عزیزوں کے انتظار میں مجبوری کے گیت گاتی رہی۔ شاہ عبداللطیف کی اس داستان کا ترجمہ سورلے کے انگریزی ترجمے کے توسط سے کیا گیا ہے۔

جو کانوں میں میرے یہ لفظیں پڑیں
"بتا میں بھلا تیرا مالک نہیں"
مرے دل نے چپکے سے "ہاں" کہہ دیا
کہ کچھ اور کہنا تو ممکن نہ تھا!
مرے لوگ مجھ سے بہت دور تھے
مرے پاس آنے سے معذور تھے
مرا قید ہونا ہی تقدیر تھی
یہ پھندہ یہ قدرت کی تحریر تھی
کہ اپناؤں گھر بار کو چھوڑ کر!
یہ زنداں۔ یہ زنداں کے دیوار و در
جو چھوڑا ہے سے اپنے میں دور ہوں
تو اس حال کو زندگی کیوں کہوں؟
خداوند میرے تو یہ حکم دے
کہ اب ماروی مارووں سے ملے
لکھی تھی مری زندگانی میں قید
ہوئی رنج و درد و مصیبت کی صید

کتاب مقدس میں ہے جو بیان
فرامن ترے پاس، تن ہے یہاں"
یہی اک دعا ہے خداوند سے
وہ قدرت سے اپنی یہ ساماں کرے
عزیزوں سے اپنے میں جا کے ملوں
شب و روز بیٹھی یہ سوچا کروں
"جو لکھا گیا پھر نہ بدلا گیا
قلم ہو گیا خشک تقدیر کا!

تراوش ہوئی کلک تقدیر سے
کہ مارو تو کانٹے چنیں دشت کے
اور ہیں الگ اس طرح سے جیوں
کہ ان بالا خانوں میں بیٹھی رہوں
عزیزوں سے دوری وطن کا تیاگ
لگا دوں نہ ان اونچے محلوں میں آگ!
ہر اک شے۔ کہیں بھی ہو کیسی بھی ہو
پلٹتی ہے اپنی قدیم اصل کو
مرے دل پہ بھاری ہے ان کا جوگ
کہاں ہیں کہاں ہیں وہ صحرا کے لوگ
یہاں ان کے آنے کی صورت بنے
کہ ملیر جانے کی صورت بنے

۲

ماروی:۔ نہ پیاں ہے یہ پیغام عزیزاں کوئی
گرد صحرا سے نہ ابھرے گا شتربان کوئی!
میرے اللہ! مری حسرت دیدار کو دیکھ
بھیج اس دیس میں اس دیس کا مہماں کوئی
خوش ہوں مسرور ہوں یہ راہیں یہ قلعے یہ فصیل
آئے پھر قطع مسافت کیے جولاں کوئی
دھوؤں ان آنکھوں سے اسکے قدم گرد آلود
جان سکتا ہے مرے شوق کا پایاں کوئی!
دور افتادہ ہوں، محبوس ہوں، غم دیدہ ہوں
لوگو! اس درد کی تسکین کا ساماں کوئی

شاعر:۔ لے تو دیں لیے آیا کوئی ڈاچی والا
اپنے محبوب کو یادوں سے فراموش نہ کر
ایسی پاگل تو نہ ہو، لوٹ کے آئے گا یہاں
ایک پل کے لیے قلعے میں ٹھہر اور ٹھہر
ایک ہی پل کے لیے قلعے میں دیدبانہ تجھے
دیکھنا تجھ سے نہ کملی یہ پرانی چھوٹے

پیاری من موہنی اونچا ہے گھرانہ تیرا
وضع مت چھوڑنا۔ دل دکھتا ہے نا تیرا
سنتے ملیر بھی ہو گا کبھی آنا تیرا

ماروی:۔ میرے بابل کے یہاں سے کوئی آخر آیا
کون آیا ہے خدارا اسے لاؤ لاؤ
اس کے قدموں پہ میں گر جاؤنگی ہو کے بھر کے
اسکو دکھلاؤں گی اس دل کے پرانے گھاؤ
"میرا کچھ دوش نہیں بات یہ میری مانو
اپنی مرضی سے نہ آئی ہوں نہ ہرگز آئی

۳

خداوندا! وہ گھر بار مارو | مجھے اپنا لیں، میری لاج رکھ لیں
میں کتنی بھی بری ہوں، ہاں بری ہوں | وہ لطف و مہربانی سے نہ گزریں

ادھر ملیر میں برکھا ہوئی ہے | پرندے چہچہاتے اڑ رہے ہیں
مرے کپڑوں کا عالم دیدنی ہے | کہ میلے ہے تکے اور گن بھرے ہیں
تو عیبوں کا چھپانے والا ٹھہرا
خداوندا! تو میری لاج رکھنا

۴

مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے، پھٹی ہے!
پھوٹی پونی، نہ گز بھر سوت کاتا
کہ آس اپنے عزیزوں سے لگی ہے
جو ہٹ میں نے پہنے تھے، وہ کپڑے
مرے تن کے لیے کافی رہیں گے
مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے پھٹی ہے!
کسی دن بھی نہ بال اپنے سنوارے
پریشاں زلف خوشبو کھو چکی ہے
کبھی مارو کے مکھڑے کو میں دیکھوں
فقط دل میں یہی حسرت بسی ہے
میں پھر صحرا میں اپنے گھر پہ پہنچوں
کہ یہ جینا بھی کوئی زندگی ہے

مری چولی میں ٹانکے سینکڑوں ہیں
مری کملی پرانی ہے، پھٹی ہے!
اسی عالم میں میں صحرا میں پہنچوں
مرے دل میں جو حسرت ہے یہی ہے

کہ ماروی مجھ کو دیکھیں اور یہ جانیں
یہ جیتی تھی امیدوں کے سہارے
کہ ہم آئیں گے اس کی سار لیں گے
چھڑائیں گے غم زنداں سے بارے
ہوا ہے جس جگہ سے میرا آنا!
کسم کا پھول واں کھلتا نہیں ہے
جہاں شادی کے میلے ہوں وہاں بھی
مجھے کلی سوا چارہ نہیں ہے

۵

نہ بالوں کو دھونا دھلانا اسے
نہ ہنسنا، نہ پینا، نہ کھانا اسے
عمر! ماروی گیت گاتی پھرے
تری داد کے، تیری بیداد کے
ترا ظلم بختا نہیں جائے گا
یہ اک دن ترے سامنے آئے گا
نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ زلفوں کی بگڑی بنانا اسے
وہ بالے وہ سبزہ گیہوں کے مکیں
انہیں ماروی بھول سکتی نہیں!
عمر! ماروی کو کہاں یہ پسند
کہ بیٹھی رہے تیرے محلوں میں بند
نہ بالوں میں پانی دکھانا اسے
نہ زنداں سے باہر ہی جانا اسے
اسے بھائے کیا ماروؤں کے بنا
یہ صابن، یہ خوشبو، یہ عطرِ حنا
کٹھن ہے یہ اس کے لیے زندگی
کہ گوری ہے دیہات کی ماروی
نہ بالوں کو پانی دکھانا اسے
نہ بھولے سے بھی مسکرانا اسے
ہے کانوں میں اس کے صدا گونجتی
صدا اے عمر! تیرے انصاف کی!
شکایت کرے ہے وہ اندوہگیں
"مرے لوگ مجھ پاس آتے نہیں

اداسی پہ مائل ہوئی ماروی ہا!
غمِ دل کی گھائل ہوئی ماروی
یہ الجھے سے گیسو، یہ چہرہ اداس
وہ اٹھتی جوانی کی بو ہے نہ باس
غموں نے اڑا دی ہے چہرے کی آب
اداسی سے سنولا گیا ہے شباب
لطیف اس کے پنڈے کو لو جو لگی!
اڑی باس خوشیوں کے کافور کی ہا!
وہ گوری کہ من جس کا بھاری رہے
خوشی کس طرح اس کو پیاری لگے
بھلا چھٹ پیاروں سے جینا ہے کھیل
نہ مسکان لب پر نہ بالوں میں تیل
جدھر اس کا مالیر آباد ہے
ادھر رخ ہے ہونٹوں پہ فریاد ہے
میں مارو کی سمرو! میں مارو کی ہوں
ترے گھر کی خوشیوں کو خوشیاں کہوں!
یہ پھانسی کا پھندا ہیں پھانسی کا جال
میں تیری بنوں یہ تو ہونا محال!
مرے دل کے وہ لوگ مالک ہوئے
چھڑانا ہے مشکل اسے قید سے
جدھر اس کا مالیر آباد ہے
ادھر رخ کیے وقفِ فریاد ہے
اسے ماروؤں نے جو دی تھی کبھی،
ابھی پاس اس کے ہے کملی وہی
تو اس کو تو سمرو نہ زنجیر کر
کہ مشکل ہے اس من کا آنا ادھر

جدھر میرا مالیر آباد ہے
ادھر قبلۂ جانِ ناشاد ہے
محل قلعے پر چڑھ کے پکاری بہت
میں کرتی رہی آہ و زاری بہت
کسی نے نہ لیکن سنی یہ فغاں
مرا درد سنتا ہے کوئی کہاں
عمر جس کا من ہو دکھی اور اداس
اسے بھائیں کیسے یہ اجلے لباس
پیا اپنے صحرا میں آہیں بھریں
غموں میں گرفتار نالے کریں!
وہ ناری ہے اے سمرو! ناری کہاں
وہ اپنے پیا کی ہے پیاری کہاں
جو الفت کے قول و قسم توڑ دے
جو پی سے خیال وفا چھوڑ دے
مرے پی پہ بھاری یہ ٹھنڈی ہوا
ترے نرم گدوں پہ سوؤں میں کیا

عمر میرے کپڑوں پہ ہنستا ہے کیوں
گدیلوں پہ آرام کیسے کروں ؟
جو پی میرا صحرا میں آہیں بھرے
غموں میں گرفتار نالے کرے
عمر ! اپنے شربت کے شیشے اٹھا
عزیزوں میں پیاسے ہی رہنا بھلا

۶

مرا دل ہے انھیں کے ساتھ سائیں
جو جنگل کے دہاتوں کے مکیں ہیں !

مجھے چھوڑے تو ان کے پاس جاؤں
ان ہی کا سا پیوں ، ان کا سا کھاؤں
جہاں تک سائیں دنیا میں جیوں گی
اسی پیارے کے قدموں پہ چلوں گی
میں بے تقصیر بیٹھی جی کھپاؤں
یہی سوچوں کہ دیس اپنے کو جاؤں
ان ہی پیاروں عزیزوں سے ملوں میں
جو موٹے جھوٹے کپڑوں ہی میں خوش ہیں

میں اس کملی کو چھوڑوں ، کیسے چھوڑوں
اس آرام اور راحت کی طلب میں
جو دو دن کے لیے ہے کچھ نہیں ہے

۷

کہاں گیا مرا حسن اے سمرو! چہرا میرا میلا
قسمت سے میرا روپ انیلا ! چھین لیا سب لوٹا
اے سمرو اک بار کسی کا !! روپ اگر لٹ جائے
لاکھ جتن کر دیکھے لیکن پھر وہ بات نہ پائے
کھو کے میں اپنا روپ اے سمرو دیس اپنے کیا جاؤں
اپنے نگر کے چرواہوں کو کیسے مکھ دکھلاؤں
جیسے تھا یاں آنا میرا ویسے ہی میرا جانا
اکثر جیسے برستی بوندیں پل پل ہے شرمانا
ان اونچے چوباروں میں ! جو جیون کے دن بیتے
زحمت ، ذلت اور ستم تھے مجھ کو وہ یاد رہیں گے
مجھ کو تو بس پی کی ہے چاہت لیکن میں شرماؤں
کس منہ سے سر اونچا کر کے ماروں آگے جاؤں
مجھ کو کہیں تو دفن ہی کر دے اے سمرو! اے بیری
میں نے یہاں پہ آکر چھوڑی ریت وہ چرواہوں کی
کاش کہ ! یہ پیدا ہی نہ ہوتی ہوتی تو مر جاتی
عمر کوٹ میں آکر اس نے جیتی یہ بدنامی
چوباروں میں بیٹھی کڑھتی ایسے وقت گزارے
چرواہوں کی مدد کی خاطر پل پل پڑی پکارے
اے اللہ ! سنے جو میری قید ہی میں مر جاؤں
دن کو تو بیٹھی روؤں دھوؤں شب کو بھی چین نہ پاؤں
لیکن مجھ کو موت سے پہلے گھر میرا دکھلا دے
کیا دھوؤں میں کپڑے اپنے میلے اور پرانے
مٹی میں ملی عزت میری مالک میرے کرم کر
سمرو ! ہے بڑی طاقت والا رحم دلا اسے مجھ پہ
گاؤں میں اپنے ہوگا وہ بانکا بیٹھی سوچ رہی ہوں
مجھ کو پی سے آس لگی ہے کب جاؤں اسے ڈھونڈوں
گھر والوں تک بات نہ پہنچی میری اس بپتا کی
ورنہ یہ قیدی قید میں اپنے اتنی بیاکل ہوتی؟
بھول گئے مجھے ماروشاید گھر کی یاد ستائے
اچھا ہے یوں ہی یاد میں ان کی موت مجھے آجائے
لاش کو میری مالک میرے گھر میرے پہنچانا
مر کر چین ملے کچھ شاید ماروؤں میں دفنانا
قبر مری مالیسر ہو تو ! میں تو یہی سمجھوں گی
موت نہیں ہے جیون ہے یہ چین سے میں سوؤں گی

۸

انہیں میں سمرو کیسے بھول جاؤں
کہ وہ گلے چرانے والے پیارے
میرے جیون میں رگ رگ میں بسے ہیں
بھلانا ان کا آساں تو نہیں ہے
محبت ان کی دل میں جاگزیں ہے
بہت دن ہو گئے ہیں مجھ کو دیکھے
وہ گلے بان وہ ان کے گھروندے
یہ جامے ریشمیں ، نرم اور ملائم
بھلا اس بات کے شایاں ہیں سمرو
کہ چرواہے کی بی بی ان کو پہنے
وہ موٹے کھردرے جاموں کو اپنے
کہیں جو لاکھ ہی کا رنگ دے لے
تو شالوں سے ہو بڑھ کر ان کی شوبھا
نہ اون ان کے برابر کی نہ مخمل
کوئی کپڑا نہ ان کو پہنچے سمرو!
مرا کمبل کہ موٹا کھردرا ہے
مجھے یہ سارے جاموں سے بھلا ہے
ہیں یہ اپنے قبیلے کی نشانی !
یہ کمبل ، کیوں اتاروں اس سے پہلے

یہ بہتر ہے کہ موت آجائے مجھ کو
ہوئے پھر تازہ یادوں کے وہ گھاؤ
مجھے ان گاؤں والوں کی جدائی
بہت ہی مضطرب رکھتی ہے سمرو!
مرے دل میں ابھی ان کی جگہ ہے
جو صحرا کے گھروندوں کے مکیں ہیں
جہاں ماروکا پیارے کا ہے ڈیرا
خدایا اس جگہ تو مجھ کو پہنچا
نہ تم جی کو دکھاؤ میرے پیارے
نہ یوں آنسو بہاؤ میرے پیارے
جہاں غم کا ہے، دکھ کا ہے بسیرا
وہی دیکھو گے پھر خوشیوں کا ڈیرا

شاعر:- جہاں دکھ ہیں وہاں سکھ بھی ہے گوری
یہ چرواہے کا دل بھی جانتا ہے
وفا پر تو جو یوں قائم رہے گی
تو یہ محبس، یہ زنداں چیز کیا ہے
ترا دل نا امیدی میں نہ بھٹکے
یہ زنجیریں تو گر جائیں گی کٹ کے

ماروی:- من میرے کا مالک مارو مارو کا من میرا
کیوں اپنا منہ دھوؤں ایسے مالک مرا کہے گا
اجنبیوں میں گئی تھی تو کیا منہ دھونے خوش ہونے
لے میں چلی اب پی کے ڈیرے چھوڑ کے رونے دھونے
(ترجمہ:- ابن انشا)

لیلاں چنیسر

(چنیسر ایک بڑا نامور شخص تھا اور لیلاں اس کی بیوی تھی، اسی زمانہ میں ایک راجہ تھا جس کی بیٹی کونرو بڑے درجہ کی مغرور تھی، اس نے اپنی سہیلیوں کے طعنوں سے چڑ کر چنیسر کو اپنے دام میں لانے کا تہیہ کیا اور لیلاں کو اپنے نہایت قیمتی ہار کا لالچ دلا کر مدعا حاصل کر لیا۔ اس طرح لیلاں اپنے شوہر کو کھو بیٹھی۔ شاہ بھٹائی نے اس واقعہ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں اس کی حماقت اور پشیمانی پر زور دیا ہے۔)

ا

لیلاں:- تو نے کیوں محو کیا ہے انھیں لوح دل سے
حاصل زیست سمجھتے ہیں جو پیارے تجھ کو!
اے مرے دسرو کنور! میرے چنیسر راجہ
دل مرا آج بھی رو رو کے پکارے تجھ کو
ان کے زخموں پہ مدھر بولوں کا مرہم رکھنا
اب بھی اپنا جو سمجھتے ہیں بچارے تجھ کو!!
ان کو خلقت کی نگاہوں میں نہ رسوا کرنا
واسطہ دیتی ہوں جینے کے سہارے تجھ کو
میں تری پیت کی ماری ہوں بچاری ابلا
کچھ خیال آتا ہے اس بات کا بارے تجھ کو
تیری سودائیاں، تو میرا اکیلا پیتم
دل پسارے تو بھلا کیسے بسارے تجھ کو

شاعر:- ایک ادنیٰ سا گلوبند تھا جس کی خاطر
کھو دیا دل کے خداوند کو ناداں تو نے
تجھ سے برگشتہ ہوا تیرا چنیسر راجا!
کپٹی کونرو سے کیا ایک جو پیماں تو نے
اپنی قسمت کا عجب الٹا ہے صفحہ غافل
بات کی ہے بڑی رسوائی کے شایاں تو نے
چل گیا ادنیٰ سے زیور کی ڈلک کا جادو
جانے کیا سمجھا تھا چاہت کو مری جاں تو نے

لیلاں:- میں یہ سمجھی تھی کہ یہ ہار مرصع دستار
ہاتھ آتے تو مرا روپ سوایا ہوگا
یہ نہ سمجھی تھی کہ یہ ہار ہے ظالم بیری
کپٹی کونرو نے کوئی جال بچھایا ہوگا

شاعر:- چل ذرا ڈال کے اب اپنے گلے میں پلّو
ڈھونڈ اس چیز کو جو کھوئی ہے لیلاں تو نے
شاید اب تجھ سے بنا لے تجھے پھر اپنا لے
عذر اس سے جو کیا عاجز و گریاں تو نے
پھر بھی مقصودِ مبارک نہ جو دل کا پایا
در گہ یار سے مجبور حیراں تو نے
یوں ہی فریاد کناں عفو کی طالب رہنا
ہاں جو چھوڑا کہیں امید کا داماں تو نے
ایک لغزش سے گنوایا، نہ گنوایا ہوتا
اپنے محبوب کا الطافِ فراواں تو نے
رکھنا فریاد و فغاں اب بھی وظیفہ اپنا
زیست کرنی ہے اگر زود پشیماں تو نے

لیلاں:- گن جو ہیں ایک زمانے کے گنائے تم نے
تم سمجھتے ہو کہ مجھ میں کوئی خوبی ہی نہ تھی
اپنی بخشش سے نوازو مجھے پیتم پیارے
کیوں کوئی اور بسے دل کی تمہارے رانی
میں نے سوچا ہے، بہت سوچا یہ آخر پایا
دہر میں سوختہ جانوں کا مقدر ہے یہی

جس پہ غصّے کی نگہ ہو تری ہیتم پیارے
باندی بن جائے جو رانی ہو جیتی رانی

۲

لیلاں :۔ آج میں در پہ ترے آئی ہوں اے پیارے
اپنا اک عمر کا سرمایہ عصیاں لے کر

تو جو آزردہ ہے کیوں آؤں میں در پہ تیرے
دل آشفتہ و مجبور و پریشاں لے کر

(ترجمہ ابن انشا)

جریدی کتابوں کا ایک نیا سلسلہ
آئن فلیمنگ
کا شہرۂ آفاق، سنسنی خیز ناول
۱۷
روشن کتابیں
گولڈ فنگر
جیمز بانڈ 007 اور گولڈ فنگر جیسے
ناقابلِ فراموش کردار
ایک ذہین جاسوس اور ایک عیّار
اور سازشی شخص کی حریفانہ ٹکّر
ترجمہ:
اسرار زیدی
قیمت صرف
-/۳
روپے
روشن
کتابیں
سب
کے
لیے
امامِ تصوف
حضرت ابوالقاسم
جُنید بغدادیؒ
کے حالاتِ زندگی، افکار و نظریات
اور تعلیمات پر مشتمل ایک ٹھوس اور
مستند کتاب
۱۸
روشن کتابیں
امامِ تصوّف
مؤلف: یونس ادیب
قیمت صرف: -/۲ روپے
مطبوعات شیخ غلام علی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور